آوارہ گرد کی
ڈائری
سفرنامہ
ابن انشا

آوارہ گرد کی ڈائری

جمشید کے ۱۰۱ کارٹونوں کے ساتھ

ابنِ انشا

۱۹۷۱

فہرست

سرِ راہے

مارک ٹوین نے اپنے ایک ناول کے دیباچے میں لکھا تھا:

"اگر کوئی شخص اس کہانی میں مقصد تلاش کرتا ہوا پایا گیا تو اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ مگر کسی شخص نے اس کتاب سے سبق لینے کی کوشش کی تو اسے ملک بدر کر دیا جائے گا اور اگر کسی نے اس میں پلاٹ تلاش کرنے کی جرأت کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔۔۔"

ہم طبیعت کے ایسے متشدّد نہیں ہیں جیسے مارک ٹوین تھے۔ تاہم اتنا خبر دار کریں گے کہ اگر کسی نے اس سفر نامے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ اچھا نہ

ہو گا اور اگر کوئی شخص اس سفر نامے کو گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی کوشش کرے گا، نتائج کا خود ذمّہ دار ہو گا۔ اصل میں یہ اس قسم کا سفر نامہ نہیں، جو سفر کے اختتام پر لکھا جاتا ہے۔ یہ تو ایک آوارہ گرد کی آوارہ ڈائری کے منتشر اوراق ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ہم یونیسکو کی دعوت پر یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں جو کُچھ ہم پر، اور ان ملکوں پر ہمارے ہاتھوں گزرتی رہی بے کم و کاست رقم کر کے اخبار میں بھیج دیا کرتے تھے پچھلی قسط میں کیا لکھا تھا۔ یہ کبھی یاد نہ رہا۔ چونکہ ہمیں جم کر لکھنے کی کبھی عادت نہیں رہی لہٰذا جو رہ گیا سو رہ گیا۔ مثلاً چیکوسلوواکیہ کی راجدھانی پراگ میں ہم نے جو چار بوہیمین دِن گزارے، وہ یاد گار دن تھے۔ سوچا ان پر ذرا بیٹھ کر دلجمعی سے لکھیں گے۔ سو یہ نہ ہوا۔ وہ دن کبھی نہ آیا۔ وارسا کی یاترا کی روداد بھی نہ لکھ سکے کہ اب کون لکھے۔ یہی حال لوسرن (سوئٹزرلینڈ) کے احوال کا ہے۔ اب تو ان کی یادیں سپنوں کے سمان ہیں۔

ہمارا یہ سفر پورے تین مہینے کا تھا۔ ایک مہینہ لندن میں۔ دو ہفتے جرمنی میں اور باقی ایّام میں باقی دیار و امصار۔ یونیسکو کا روزانہ بھتّہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی اونچے ہوٹل میں ٹھہر سکے اور کام و دہن کی معقول تواضع کر سکے۔ فائدہ یہ کہ مسافر

میں تن آسانی پیدا نہیں ہوتی۔ ریاضت اور مجاہدے کے معنی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ پیدل چلتا ہے اور بھوک رکھ کر کھاتا ہے (اگر کھاتا ہے تو) اس کا صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ ہم بھی اپنے بدن کے ۲۰ پاؤنڈ گھٹا کر لوٹے تھے۔ شاید یونیسکو کا منشا بھی یہی تھا۔ جوتا بھی ایک گھِس گیا۔ دوسرا خریدنا پڑا۔ ایک بات ہے البتّہ ان چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں نے جن میں بعض کے دروازے اوو ائن سے کھلتے بند ہوتے تھے اور ان کے غسل خانوں نے ہمیں لکھنے کا مواد بہت کچھ مہیّا کیا۔ بارہ ولایتوں اور ستائیس شہروں کا یہ سفر بہت سے اور سفروں اور آوارگیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا لیکن ان کی داستان طویل ہے اور چونکہ مشرقِ بعید، امریکہ اور یورپ سب کو محیط ہے اس لیے اس کا نام ہم نے دنیا گول ہے، تجویز کیا ہے۔ یہ پڑھنے کے بعد جی چاہے تو اسے بھی پڑھیے۔

ابنِ انشا

۲۲ مئی ۱۹۷۱ء

پیرس

۶ ستمبر تا ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷ء
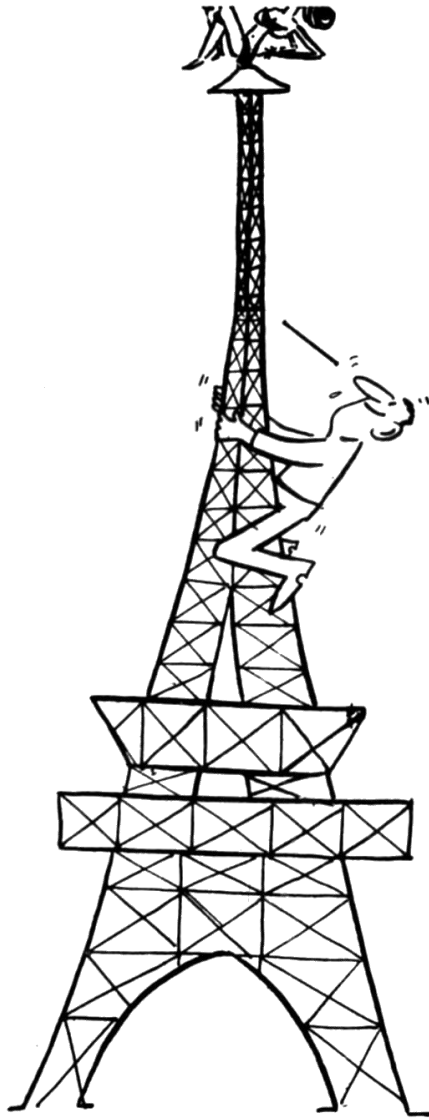
یہ پیرس کا ہوٹل مالار ہے

یہ پیرس کا ہوٹل مالار ہے۔ اس وقت جبکہ ہماری جہاں گردی پر رشک کی نگاہ کرنے والے کراچی میں اپنے خوانوں پر ترلُقمے اُڑا رہے ہوں گے، یہ آوارۂ کوئے بتاں آوارہ ترِ بادا پنیر کے بد مزہ اور سخت سینڈوچ کھا کر بیٹھا اور نمک سلیمانی پھانک رہا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ پیرس جانے والا جاتے ہی پریوں کے جھرمٹ میں گھِر جاتا ہے اور ان کا دِن عید اور رات شب برات ہوتی ہے، انہیں یہ جان کر اطمینان ہونا چاہیے کہ ابھی ہم دِن بھر کی گردش کے آبلے پھوڑ کر بیٹھے ہیں، دِل کے پھپھولوں کی باری آتی معلوم نہیں ہوتی۔

ہوٹل مالار کو پیرس کا ملباری ہوٹل کہہ لیجیے تو مضائقہ نہیں۔ وہی ہیبت وہی شوکت وہی شان دل آرائی۔۔۔ یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسّر ہے۔ اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے۔ بلب کی روشنی خاص طور پر اس لیے

دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب نہ کرے۔ باتھ روم ایسی تنگنائے غزل ہے کہ ہم نے فوّارہ کھول تو لیا لیکن بدن پر صابن نہ لگا سکے، کیونکہ ہمارے قارئین میں سے جو صاحبان کبھی نہائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لیے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے اور اس حمام باد گرد کی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔ ایک اور بات اس ہوٹل میں ہمارے گھر کی سی یہ ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات سُنتا نہیں۔ سُنتا ہے تو سمجھتا نہیں اور سمجھتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔

ہمارا یورپ کا یہ پھیرا پورے چھ سال بعد پڑ رہا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں یہی دِن تھے بلکہ عجب اتّفاق ہے کہ ستمبر کی پانچویں ہی تھی جب ہم نے کراچی سے اُڑان کی۔ اس وقت بھی ہم چار روز کو پیرس میں اُترے تھے اور پیرس کی دیدنی چیزیں دیکھ لی تھیں۔ لیکن اب تو اُن کی یادیں ایک خواب کے سمان ہیں۔ آج شام ہم ایفل ٹاور کی طرف جا نکلے تو پھر آسمان چھونے کو جی مچلا۔۔۔ لیکن فقط دوسرے مالے تک جا سکے۔ تیسرا کسی وجہ سے بند تھا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تنہائی کا عذاب نہ تھا۔ ہم دو آدمی تھے۔ خریداری ہر چند کہ اس وقت بھی اسی طرح کرتے تھے کہ انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ یہ اور وہ۔۔۔" اس کے بعد مٹھی بھر پیسے نکال کر آگے کر دیے کہ لے لو

BATH

جتنا جی چاہے۔ دو آدمیوں کے ہمہ وقت ساتھ رہنے کا لُطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کل ہمارے دوست ہاشم نے کہ سفارت خانے میں پریس اتاشی ہو کر آئے ہیں ہمیں دال بھات کھلا دی تھی لیکن پرسوں رات ہم پر عجب ماجرا گزرا۔ ہوا یہ کہ سید والی اللہ نے جو چھ سات سال سے پیرس میں ہیں، ہمیں فون کیا کہ کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات۔۔۔ میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تمہیں ہوٹل سے آلوں گا۔ ہمیں یہ بات کچھ پسند نہ آئی کہ وہ کھانا بھی کھلائیں اور لینے بھی آئیں۔ لہٰذا عذر کر دیا کہ اس وقت ایک اور صاحب نے تکلّف کی دعوت کر رکھی ہے۔ وہاں جانا ہے۔ آپ کے ساتھ تو گھر کا سا معاملہ ہے۔ پھر کبھی سہی۔ انہوں نے فرمایا: "اچھی بات۔۔۔ میں مجبور نہیں کرتا۔"

ہم نے شہر کا نقشہ ہاتھ میں لیا اور شانزالیزے کی راہ پکڑی۔ خاصا لمبا چکر پڑا اور محرابِ فتح تک پہنچتے پہنچتے کچھ سردی نے اور کچھ بھوک نے لہراد کھانا شروع کیا۔ شانزالیزے پر کہ پیرس کی مال روڈ ہے، ہوٹلوں اور کیفوں کی کمی نہیں۔ ہم نے ایک دو کو ٹھٹک کر دیکھا۔ گائیڈ بک کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک وقت کا کھانا ستّر سے نوّے فرانک تک قیمت پاتا ہے۔ سینڈوچ وغیرہ لیے جا سکتے تھے لیکن ایک تو سور کے قتلوں کا ڈر دوسرے جہاں نگاہ کی شراب کے شیشے تو ضرور نظر

آئے، چائے کافی کا سامان دکھائی نہ دیا۔ یاد رہے کہ یہاں شراب پانی سے سستی ہے۔ سادہ پانی کی بوتل ایک روپے میں آتی ہے، شراب کا جام چھ آنے آٹھ آنے میں۔ اپنی جیب کو دیکھتے ہوئے تو ہمیں مَے ہی پینی چاہیے۔ لیکن عادت کا کیا کریں:

قرض کا پیتے ہیں پانی، پر سمجھتے ہیں کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دِن

خیر! جی میں یہی ٹھانی کہ محرابِ فتح سے اپنے گھر کا رُخ کرو اور گلی کے کونے پر جو کیفے ٹیریا ہے، وہاں سینڈوچ کھاؤ، کافی پیو اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوتے سو جاؤ۔ سوِء اتّفاق سے ہم راستہ بھول کر کہیں کے کہیں جا نکلے اور اپنی گلی تک آتے آتے ساڑھے نو کا عمل ہو گیا۔ دیکھا کہ وہ کیفے بند ہے۔ دور دور تک اور بھی کوئی دُکان کھلی نظر نہ آئی۔ چند قدم پر ایک مٹھائی بسکٹوں والے کا اسٹور تھا وہ بھی بند نکلا۔ ایک نکّڑ پر فقط ایک تمباکو سگرٹوں والے کا کیبن کھلا تھا۔ لیکن ماکولات میں سے کوئی چیز اس کے پاس بھی نظر نہ آئی۔ اب بھوک خوب چمک گئی تھی اور اتنی لمبی کالی رات سامنے تھی۔ سوچا کہ ہوٹل کی خادمہ سے کہیں گے کہ بی بی ہمیں ایک کپ کافی کا بنا دو اور ہو سکے تو ناشتے کے لیے جو ڈبل روٹی آئی ہو گی اس میں سے کچھ مکھن یا جام

کے ساتھ عنایت کر دو۔ جان و مال کو دعائیں دیں گے۔ لیکن وہ عفیفہ اس وقت بر تن اوندھائے ٹیلی وژن دیکھنے میں مصروف تھی۔ ہم نے کچھ دیر توقّف کیا کہ پروگرام ختم ہو لے، لیکن وہ تو کوئی لمبا ڈراما چل رہا تھا۔ ہم نے اس کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے سلام بھی کھینچ مارا اور یہ بھی کہا کہ ہمارے کمرے کی بتّی خراب ہے۔ لیکن اس نے ٹیلی وژن سے دھیان ہٹائے بغیر وعلیکم السلام کہہ دیا اور یہ کہ بتّی کی بات کل دیکھی جائے گی۔

اب ہم پھر اپنے کمرے میں آئے اور کنڈی لگا کر سوچنے لگے کہ کیا کھایا جائے شاید کوئی ٹافی وغیرہ کوٹ کی جیب میں ہو۔ نہیں۔۔۔ کوئی نہیں۔ پانی ضرور دھرا ہے، لیکن وہ تو پانی ہے۔ ہم اپنے ساتھ کراچی سے اگر کھانے کی کوئی چیز لے کر چلے تھے تو وہ دو شیشیاں کارمینا کی تھیں اور ایک نمک سلیمانی کی۔ دو ٹکیاں کارمینا کی کھائیں لیکن وہ سونے پہ سہاگہ ہو گیا۔ اے کاش حکیم سعید نے بھُوک بڑھانے کی بجائے بھُوک مٹانے کی گولیاں بنائی ہوتیں۔ اب ہم بستر پر سیدھے بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ کب صُبح ہو اور ناشتہ ملے۔ لیکن ابھی تو دس بھی نہ بجے تھے۔ آخر یاد آیا کہ پی آئی اے والوں نے چھوٹا سا سونف کا ایک پیکٹ دیا تھا۔ کوئی تولہ بھر سونف اور دو تین دانے اس میں چھالیا کے۔۔۔ ڈھونڈنے پر نکل آیا۔ ہم نے اس پر دانت تیز

کیے۔ سونف تو بجائے خود اشتہا افزا ہے۔ لیکن چھالیا کام کی چیز نکلی۔ معدے نے درد کی دوا پائی۔ کچھ خلا پانی سے پر ہوا اور پیٹ کے الاؤ کو دھیما کر کے ہم بستر میں گھُس گئے۔

آنا فائر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر

ہمارے ہوٹل میں کوئی شخص انگریزی جانتا بولتا نہیں یہی حال ہماری فرانسیسی کا ہے کہ رفت گیا اور بود تھا سے آگے نہیں جاتی۔ پڑھنا تو اس زبان کا ایسا مشکل نہیں، لیکن بولنا؟ فرانسیسی میں سب سے مشکل مرحلہ یہی ہے۔ یہ ظالم لکھتے تو اے سے زیڈ تک سبھی حروف ہیں لیکن بولنے میں ان میں سے دو تہائی کو پی جاتے ہیں۔ پیرس ان کے ہاں پاری ہے اگرچہ بعضے بولنے میں اسے پغیہ بھی بنا دیتے ہیں۔ مشہور سڑک Champ Elysees کو آپ انگریزی میں شاید پڑھیں گے چیمپ الی سیز، جبکہ یہ ہے شانز الیزے۔ جس کے سرِ راہ کیفوں میں سُنا ہے جمیل الدّین عالی گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے اور دوہوں کے لیے مضمون اکٹھے کرتے تھے۔ ہماری مرغوب سڑک انگریزی کے قاعدے سے بولوارڈ سینٹ مائیکل ہونی چاہیے Boulevard St. Michel لیکن فرانسیسیوں کے نزدیک بلوار سال مثال ہے۔ ہم میترو یعنی

زمیں دوز ریل میں سفر کرتے ہیں۔ ہمارا بتایا ہوا اسٹیشن کا نام کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا نہ کسی کا بتایا ہوا ہماری سمجھ میں آیا۔ لکھ کے بتاتے ہیں تو مخاطب کہتا ہے۔۔۔

"اچھا یہ مطلب ہے، تو میاں یوں کہو نا"

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

تھک ہار کے ہم نے زبان کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا ہے ممکن نہیں کہ شیخ امرا القیس بنیں۔ پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں۔ رستہ پوچھیں تو مہربان فرانسیسی آدھا گھنٹہ تک غوں غاں کرتا ہے اور اپنی طرف سے وضاحت سے سمجھاتا ہے لیکن ہمارے کام کی

چیز فقط اس کی انگلی کا اشارہ ہوتا ہے ہم نے بھی اب اشاروں کی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہے کہ رازی کے نکتہ ہائے دقیق تک ان میں بیان کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اشارہ بھی رنجک چاٹ جاتا ہے۔ ہم کل نیچے میترو کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر ایک صاحبِ دِل فرانسیسی سے پوچھ بیٹھے کہ کیمبروں کا اسٹیشن جہاں ہمیں جانا ہے (انگلی سے اشارہ کر کے) اُدھر ہے یا اِدھر ہے۔ ایسا اکثر ہوا کہ ہمیں جانا مشرق کو ہے اور پہنچ گئے مغرب میں۔ اس بھلے مانس نے ہمارے بار بار کے استفسار کے جواب میں اپنی انگلی سے برابر نیچے ہی اشارہ کیا، کہ اِدھر نہ اُدھر بلکہ گاڑی یہیں آئے گی۔۔۔ ہم عاجز آ کر وہاں سے کھسکنے لگے تو ہمیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور زبردستی اس گاڑی میں بٹھایا جو اُلٹی طرف کو جاتی تھی۔ ہمارے دوست ہاشم نے کہ فرانس میں تازہ وارد بساط ہوائے دل ہیں یہ نسخہ دریافت کیا کہ منہ پورا کھول کر آواز نکالو، تب صحیح فرانسیسی لہجہ بر آمد ہو گا لیکن خود اُن کے ساتھ یہ گزر چکی ہے کہ ایک ریستوران میں انہوں نے کسی چیز کا آرڈر دیا جو تین فرانک کی تھی۔ بیرا اس نام سے ملتی جلتی دوسری چیز لے آیا جس کے انہیں اکیس فرانک دینے پڑے۔ ممکن ہے انہوں نے مُنہ پورے سے کم کھولا ہو یا زیادہ کھول دیا ہو۔ بہر حال اب ان کا کہنا ہے کہ جب تک پوری طرح فرانسیسی پر عبور نہ حاصل کر لوں۔ کم از کم خریداری میں فرانسیسی

استعمال نہ کروں گا۔ ان کی یہ احتیاط عین دانشمندی ہے۔ ایک دوست ہمارے انہی کے سے تیراکی کا شوق رکھتے تھے لیکن کہتے تھے کہ جب تک اچھی طرح تیرنا نہ سیکھ جاؤں پانی میں نہیں اتروں گا۔۔۔ چنانچہ نہیں اترے۔

جب ہم رات کو گھر یعنی ہوٹل کے کمرے میں آتے ہیں تو کاؤنٹر پر جو صاحبہ ہیں، ہمیں ضرور کُچھ نہ کُچھ (فرانسیسی میں) بتاتی ہیں کہ یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے۔ ہم شکریہ ادا کر کے اوپر آجاتے ہیں۔ انہوں نے پیغام دے دیا ہم نے سُن لیا۔ الاعمال بالنیّات۔

ہمارے دوست مرزا نسیم بیگ یونیسکو میں تیرہ برس سے ہیں اور فرانسیسی فَر فَر بولتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تُم پر کیا گزرے گی جو مُجھ سے شروع کے ایّام میں گزری۔ ہم نے کہا۔ ارشاد! تب انہوں نے بیان کیا کہ میں نے مکان لیا تو گھر کے کام صفائی وغیرہ کے لیے نوکرانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں کے نوکر بھی نوّاب ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال کسی نے بتایا کہ گلی کے کونے پر جو تمباکو فروش کی دُکان ہے وہاں اپنا نام پتہ دے دو۔ ان کے پاس کوئی کام کی متلاشی آئے گی تو تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ پس مرزا صاحب نے اپنی غوں غاں کر کے تمباکو فروش کو فرمائش نوٹ کرادی اور اپنا پتہ دے دیا۔ آگے ان کی زبانی سنیے!

تیسرے روز کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کھولا تو دیکھا ایک خاتون کھڑی ہیں۔ اچھی خاصی معزّز۔۔۔ لیکن کام کے اوقات کے باہر تو ہر کوئی شان کا لباس پہنتا ہے۔ کنجڑے قصائی تک سوٹ پہن کر صاحب بہادر بن جاتے ہیں۔ میں نے انہیں عزّت آور سے بٹھایا۔ گفتگو شروع ہوئی، انگریزی میں:

Speak English?(انگریزی بولتے ہو؟) محترمہ نے پوچھا۔

Yes, Speak English۔(ہاں، بولتا ہوں) میں نے کہا۔

Work?(کام؟)

Yes، Work.(ہاں کام)

"کتنے گھنٹے؟"

"یہی چار پانچ گھنٹے۔"

"تنخواہ؟" ان محترمہ نے سوال کیا۔

"وہی جو عام طور پر ہوتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہفتہ اتوار چھٹی؟"

"ہاں ہفتہ اتوار چھٹی"

"کب سے کام شروع کرنا ہے؟"

"جب سے آپ کا جی چاہے"

"آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے۔"

ان محترمہ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر اپنا پتہ لکھ کر کہا "یہ لو اس پتے پر آ جانا۔"

تب جا کر بھید کھلا کہ وہ محترمہ خود ایک نوکر کی تلاش میں تھیں۔ تمباکو فروش نے بتایا ہو گا کہ ایک صاحب آئے تھے۔ کسی کام کی تلاش میں ہیں، یہ رہا ان کا پتہ۔ وہ بیچاری نوکر کے لیے ترسی ہوئی خود میرے غریب خانے پر پہنچ گئیں۔

دوسرا واقعہ جو مرزا نسیم بیگ کے ساتھ گزرا، نسبتاً زیادہ سنگین تھا۔ ان دِنوں یہ ۹۵

وکٹر ہیوگو ایونیو پر رہتے تھے۔ ایک روز شام بیگم کے ساتھ باہر نکلے تو چابی اندر ہی بھول گئے۔ دروازہ اس قسم کا تھا جو بند تو خود بخود ہو جاتے ہیں لیکن کھلتے چابی سے ہیں۔ واپسی رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو چابی ندارد۔ کریں تو کیا کریں۔ نیچے ڈیوڑھی میں ایک بڑی بی رہتی تھیں۔ ان سے عرض حال کیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتی تھیں، سمجھ گئیں اور ان کو مشورہ دیا کہ فائر بریگیڈ کے دفتر جاؤ ان کے پاس لمبی سیڑھیاں ہوتی ہیں، ان کی مدد سے کوئی شخص باورچی خانے کے روشن دان میں سے گھُس کر اندر سے کنڈی کھول دے گا۔ آسان سی بات ہے۔

فائر بریگیڈ کا دفتر پچھواڑے ہی میں تھا، انہوں نے وہاں جا کر مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کی۔ ایک دو لفظ فرنچ کے، کُچھ انگریزی، باقی اشارے۔ وضاحت کے لیے چٹ پر گھر کا پتہ لکھا "۹۵ وکٹر ہیوگو ایونیو" داروغہ صاحب نے اسے دیکھتے ہی سیٹی دی اور ایک بٹن دبایا۔ پھاٹک خود بخود کھل گیا اور دو فائر بریگیڈ کے انجن باہر نکل پڑے، فائر میں پہلی منزل پر چوکس بیٹھے تھے، ان کو حکم رہتا ہے کہ سیڑھی یا لفٹ کا انتظار مت کرو، جونہی حکم ملے پانی کے پائپ سے پھسل کر نیچے آ جاؤ چنانچہ ایک کے بعد ایک نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ مرزا صاحب کو صورت حال کا احساس ہوا

بھاگے بھاگے ان کے پاس گئے۔ ان کو ہاتھ کے اشارے سے روکا لیکن جس کو روکتے وہ ان کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیتا تھا اور کہتا "۹۵ وکٹر ہیو گو ایونیو" یعنی یہ کہ تمہارے کُچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہمیں گھر کا پتہ معلوم ہے دیکھتے دیکھتے وہ انجنوں پر سوار گھنٹیاں گھنٹے بجاتے روانہ ہو گئے۔ ان کے شور سے سارے محلے میں جاگ ہو گئی اور لوگ چونک کر کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگے کہ کیا اُفتاد آن پڑی۔ بعضوں نے فائر بریگیڈ دیکھ کر فرض کر لیا کہ آگ لگی ہے اور شور مچانا اور دھڑا دھڑ باہر چھلانگیں لگانا شروع کر دیا۔ ایک فائر مین نے اُن کے فلیٹ کی کھڑکیوں پر پانی تڑیڑا بھی دینا شروع کیا اور دوسرا کلہاڑا لے کر اوپر چڑھ گیا، لیکن آگ نہ دھواں، کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ ہجوم میں ایک صاحب انگریزی دان بھی تھے، ان کو مرزا صاحب نے بتایا کہ چابی اندر رہ گئی ہے فقط اس کو نکلنا ہے۔ لِللہ ان سے کہیے کہ اتنے کھڑاگ کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک آدمی اندر گھُس کر دروازہ کھول دے بڑی مہربانی ہو گی۔ وہ لوگ بکتے جھکتے چلے گئے اور رپورٹ کی کہ ان صاحب کے ہاں تھا کیا جسے آگ لگتی، ناحق غَلَط اطلاع دے کر ہمارے کام کا نقصان کیا ہے، ان سے ہرجانہ لیا جائے۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔
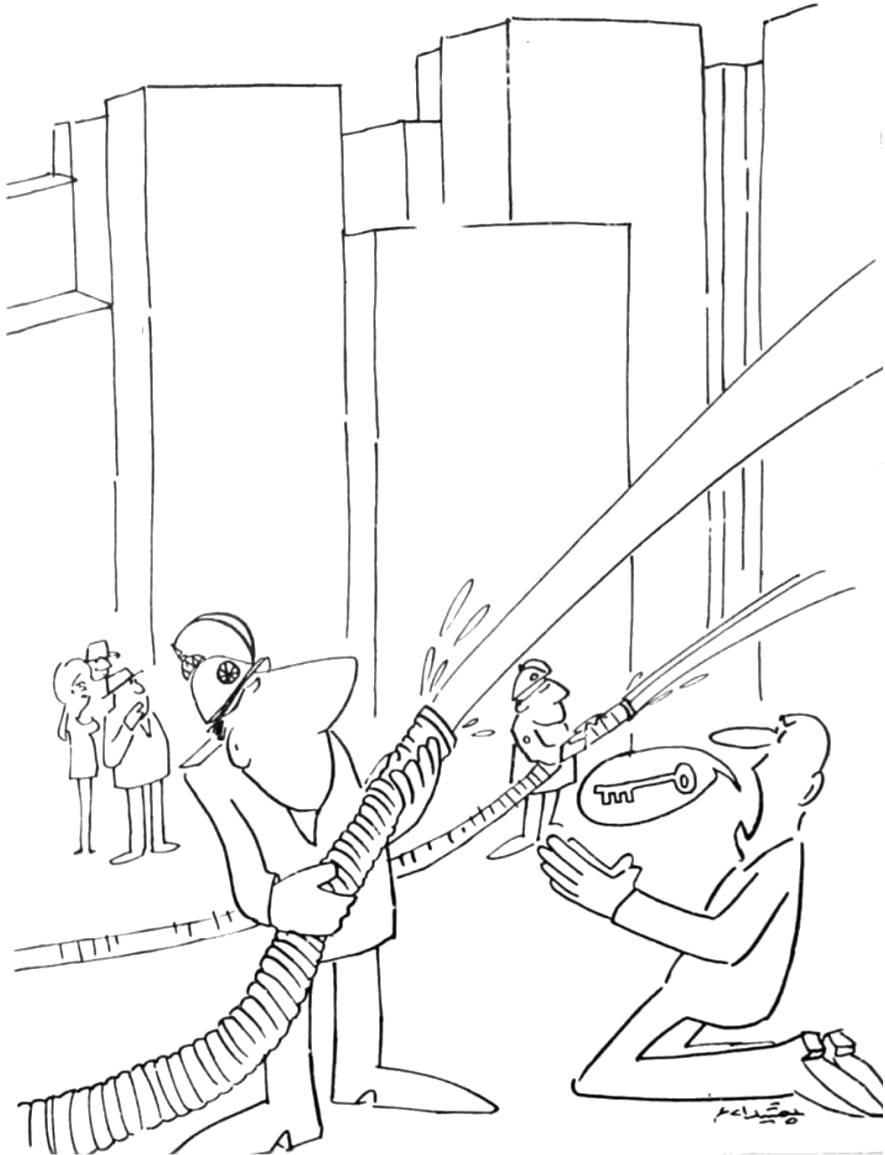
ہماری گلی کے سِرے پر ایک بہت پرانی بلڈنگ تھی، اٹھارویں صدی کے اوائل کی۔ کسی امیر کی حویلی رہی ہو گی۔ اس پھاٹک پر ایک بورڈ ہم نے دیکھا Sortie De Voitres۔ ہم نے جی ہی جی میں فرانس والوں کی تعریف کی کہ اپنی تاریخی عمارتوں کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے بورڈ لگا دیا ہے کہ کوئی اسے گزند نہ پہنچائے۔ اس گلی میں آگے جا کر ایک عمارت کے پھاٹک پر یہی لکھا دیکھا۔ وہ بھی پرانی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ گویا محکمہ آثارِ قدیمہ نے تہیّہ کر لیا ہے کہ پیرس کی عمارتوں کی پرانی شان بر قرار رکھی جائے۔ لیکن بڑی سڑک پر ہم مڑے تو ایک بالکل نئی عمارت کے ماتھے پر یہ بورڈ دیکھا۔ اب ہم چکنم میں پڑ گئے کہ اس سے آثارِ قدیمہ والوں کا کیا تعلّق؟ آخر ایک صاحب سے پوچھا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہر دوسرے گھر کے پھاٹک پر لکھا ملے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے موٹر نکلے گی۔ کوئی صاحب اپنی گاڑی سامنے کھڑی کر کے راستہ بند نہ کریں۔

ایک اور نوٹس ایک دیوار پر نظر آیا Defence D'Afficher آخری لفظ کا مطلب تو ہوا افریقہ اور ڈیفنس کا مطلب سب جانتے ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ الجزائر کی جنگ کے دِنوں میں فرانسیسیوں کا جن سنگھی طبقہ اس بات کے لیے مظاہرے کر رہا تھا کہ افریقہ کی حفاظت کرو یعنی حریت پسندوں کی شورش کو دباؤ۔ افریقہ پر اپنا قبضہ

بر قرار رکھو۔ یہ نعرہ جو جا بجا ہر سڑک پر لکھا نظر آیا۔ تو ایک فرنچ دان دوست کے سامنے ہم نے سامراجی فرانسیسیوں کی ذہنیت کا ماتم کیا۔۔۔ اس نے کہا تمہارا جذبہ قابلِ تعریف ہے لیکن اس فقرے کا مطلب ہے "یہاں اشتہار لگانا منع ہے" شانزالیزے پر ایک جگہ بہت سی چمکیلی کاریں کھڑی نظر آئیں۔ اوپر موٹے لفظوں میں لکھا تھاOccasions ۔ ہم حیران کہ اس لفظ کے استعمال کا یہ کون سا موقع ہے۔ کئی دِن کے بعد بھید کھلا کہ اس کا مطلب ہے سیکنڈ ہینڈ۔ وہ ساری موٹریں سیکنڈ ہینڈ تھیں اور برائے فروخت تھیں۔ دمِ تحریر ہماری زبان دانی کی زنبیل میں بوں ژور (صُبح بخیر بلکہ دِن بخیر) کے علاوہ جو الفاظ ہیں ان میں ایک Sortie بھی ہے کیونکہ یہ ہر جگہ ہر عمارت میں زمیں دوز ریلوے اسٹیشنوں پر سینماؤں میں عجائب گھروں میں لکھا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے Exit یعنی باہر جانے کا راستہ۔ ہاشم نے کہا اسے مت بھولنا۔ بڑے کام کا لفظ ہے۔ کوئی اُفتاد آن پڑے تو کم از کم یہ تو جان لو گے کہ کِدھر کو بھاگنا ہے اور واقعی ہم Sortie کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ایک جگہ دم لینے کو رُکے بلکہ روکے گئے تب پتہ چلا کہ ہم فرانس کی حدود سے باہر آ گئے ہیں۔ ایک انگریز سارجنٹ ہمارا شانہ ہلا کر کہہ رہا تھاNo Entry ۔ پہلے اپنا پاسپورٹ دکھاؤ، میاں جی۔
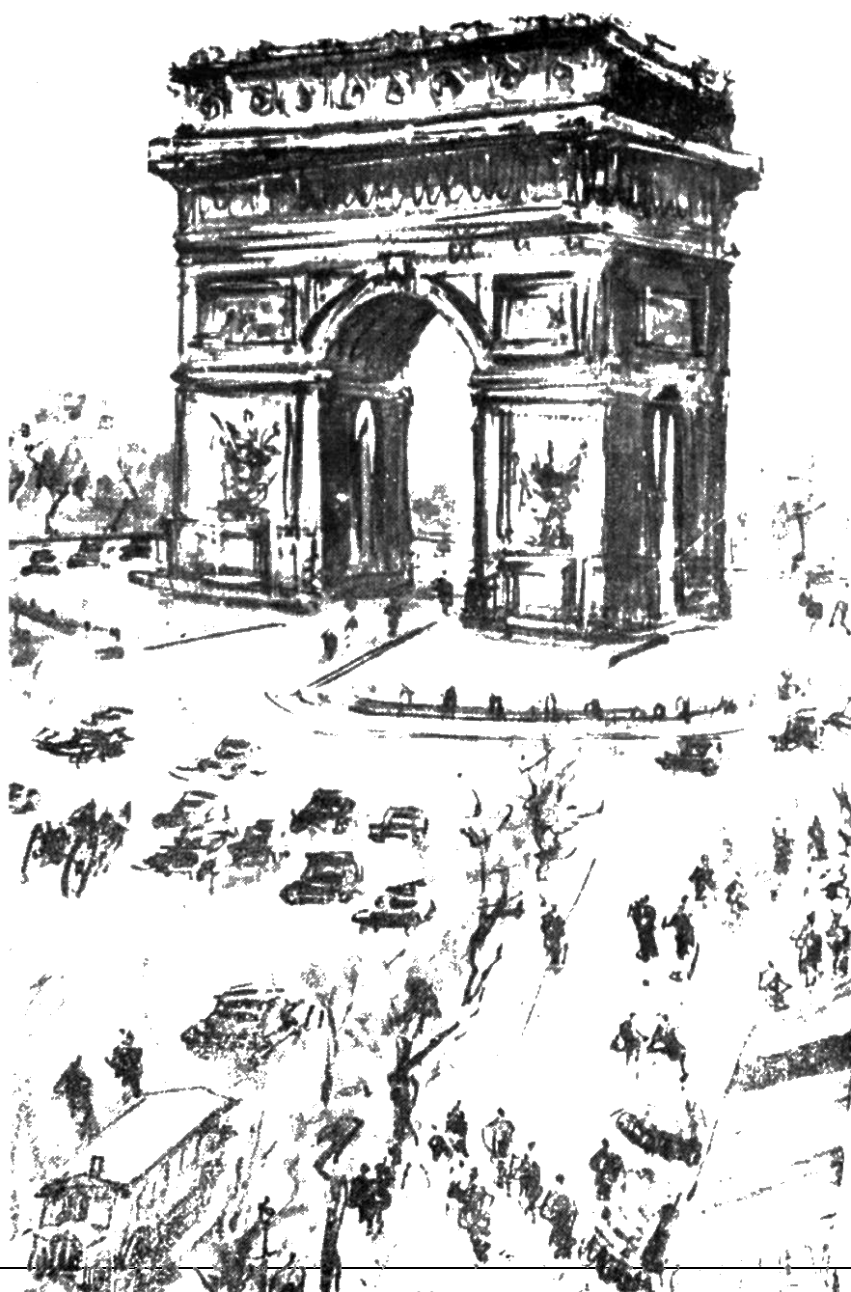
متفرقاتِ پیرس

پیرس میں جس روز ہم اُترے، اسی روز جاڑے نے نزول اجلال کیا۔ جانے کس نے موسم کو خبر کر دی تھی کہ ایک غریب الدّیار ہلکا سا سوٹ پہن کر گھر سے نکلا ہے۔ خیمہ و خر گاہ بھی نہیں رکھتے۔ اس عروس البلاد میں بلانے والے اسے چالیس فرانک روزانہ دیں گے اور بھوکا ماریں گے کیونکہ اتنا تو اس کے ہوٹل کا کرایہ ہی ہے۔ مَے نہ پیتا ہے نہ پینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ پہلو میں دِل گرم ضرور ہے بلکہ یوں کہیے کہ کبھی تھا کیونکہ وہ بھی لوگوں کی سرد مہریوں کے تھپیڑے کھا کھا کر شیر گرم رہ گیا ہے بقول انگلستان کے آغا حشر، ولیم شیکسپیئر کے:

چل اے ہوائے زمستان چل اور زور سے چل

تو سرد مہریٔ احباب سے زیادہ نہیں

اٹھ ہی جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے

کہہ نہیں سکتے کہ پیرس کی کس بات پر ہمارا دل آیا۔ خوباں تو یہاں کے جیسے بھی ہوں۔ لیکن ہمیں سین کے ساحلوں کی آوارہ گردی، پرانی کتابوں، نقشوں اور

تصویروں کی سیر دریا، دکانوں کے ذخیرے اور شاہراہ ساں مثال۔۔۔ .ST MICHAEL کا ماحول خاص طور پر بھائے۔

درس گاہوں کا ماحول ہم آپ جانتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ جور اُستاد سخت گیر وارڈن۔۔۔ آپ من چلے ہیں تو اُونچی دیواریں پھاندیے۔ کمندیں پھینکیے ورنہ۔۔۔ لیکن سوربون کے طالبِ علموں کو فرانس کی روایات آزادی سے حصّہ وافر ملا ہے۔ ان طالب علموں میں گورے بھی ہیں، کالے بھی۔ دیوار رنگ جو برطانیہ میں کم کم اور امریکہ میں بہت اونچی ہے۔ فرانس میں وجود نہیں رکھتی۔ کالوں کو دیکھا کہ شکلیں تو ہم ایسی لیکن نصیبے سکندری۔ ہر زاغ کی چونچ میں ایک ایک دو دو انگور۔ جوانی کی راتیں مُرادوں کے دِن۔ اے میاں کیوں اتنی دیر کر کے آئے۔ اب ہمیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔۔۔ یہاں کے لوگ بھی طالبِ علموں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اگر کسی ڈرامے یا شو کا ٹکٹ دس یا بیس فرانک ہے تو طالبِ علم کا ایک فرانک بھی بہت جانا جاتا ہے۔ یہ بے چارے بھی قلندرانہ زندگی کے عادی ہیں۔ کوچہ ساں مثال کے دورویہ سستے کیفوں کی قطاریں ہیں۔ طالبِ علموں کے غول باہر لگے ہوئے مینو پڑھ کر کم خرچ کھانوں کا انتخاب کرتے ہیں بلکہ زیادہ تر تو چمچے اور پلیٹ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے، ہاتھ میں سینڈوچ ہے جب ذرا گردنِ جھکائی کھا

لیا۔ اس آزادی اور شانِ قلندری کی توقع لندن، آکسفورڈ یا کیمبرج کے طالبِ علم سے نہ رکھیے۔

حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں یورپ کے لیے نئی بات نہیں۔ اب تو پردے پر پردا اٹھ رہا ہے۔ لیکن اتنا ہم کہیں گے کہ پیرس میں لندن کا سا ابتذال نہیں۔ لندن میں تو سیدھی سادھی جسم فروشی ہوتی ہے۔ پیرس میں لب و کنار کی دعوتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ع

چھاتی سے لگا چوم لیا، ہو گئے چپکے

لیکن غنڈہ گردی اور بیسوا پن نہیں۔ عاشقی بھی سلیقے کی اور فاسقی بھی سلیقے کی۔ اِدھر ہمارے پیرس سے جانے کے دِن قریب آتے جارہے تھے یعنی گاؤں کنارے باجا باجے، لندن دیس بسانا ہو گا۔۔۔ اُدھر پیرس سے محبّت بڑھتی جارہی ہے۔

"خود بخود دِل میں یہ شہر سمایا جاتا"

شہر تو ہم نے اور بھی دیکھے ہیں لیکن جو بات پیرس کی ہے وہ اور کہاں!

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

زبان نہیں آتی، بھلے سے نہ آئے۔ آخر گزارہ چل ہی رہا ہے چھ سال پہلے ہم نے پیرس قطعی مسافرانہ یعنی سیاحانہ دیکھا تھا۔ ایک ٹورسٹ بس میں بیٹھ گئے تھے اور اس نے شہر میں گھما دیا تھا کہ یہ نپولین کا مقبرہ ہے، یہ محراب فتح ہے، یہ نوتری ڈیم کا گرجا ہے اور وہ لوور کے درودیوار ہیں۔ دور سے دیکھ لو، پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یہ تو کُچھ دیکھنا نہ ہوا۔ اس بار ہم نے اپنے شوق کو رہبر بنایا اور اپنی ٹانگوں کی سواری پسند کی۔ نوتری ڈیم یا نوتری دامے کو جی بھر کے فرصت سے دیکھا۔ مذہبی سروس میں بھی پچھلی بنچوں پر بیٹھے اور اس کی عظمت و جبروت کا نقش دِل پر لے کر اُٹھے۔ پیرس میں یہ سب سے محترم عبادت گاہ ہے لیکن ہم تو اسے وکٹر ہیوگو اور اس کے ناول ''نوتری ڈیم کا کبڑا'' کے حوالے سے جانتے ہیں۔ یہاں ایک زمانے میں جیوپیٹر کا مندر رہوا کرتا تھا۔ اس کی جگہ بارہویں اور چودھویں صدی عیسوی کے درمیان یہ گرجا تعمیر ہوا۔ ذرا اس کی رفعت کو دیکھیے اور وسعت کو دیکھیے۔ اس کی پیشانی کے مجسّموں کو دیکھیے۔ اس کی رنگین منقّش کھڑکیوں کو دیکھیے بلند و بالا ستونوں اور مخروطی چھت کی زیبائش پر نظر کیجیے۔ جانے کتنے برس اس کام میں لگے ہوں گے۔

فرانسیسی لوگ اپنی زبان پر ایسا فخر کرتے ہیں کہ شاذ و نادر ہی کہیں انگریزی کا کوئی نوٹس ملتا ہے لیکن نوٹرے ڈیم کے دروازے کے پاس جو نوٹس ہے وہ انگریزی میں

ہے۔

ٹورسٹ کا مطلب ہے امریکن ٹورسٹ

”یہ میوزیم نہیں ہے، خانۂ خدا ہے۔ یہاں ڈھنگ کا لباس پہن کر آؤ۔ اسے کھیل کا میدان یاساحلِ بحر مت تصوّر کرو کہ کچھ پہنا پہنا، نہ پہنانہ پہنا۔“

لہجے سے پتہ چل جاتا ہے کہ خطاب دنیا کی سب سے امیر لیکن نو دولتی قوم امریکہ

سے ہے۔ یا پھر ایک تحریر ایونیو بوسکے کی ایک دیوار پر انگریزی میں نظر آئی۔

Go Home U.S

لندن

۱۳ ستمبر تا ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۷ء

لندن سے ایک خط

عالی میاں!

یہ لندن ہے اور لندن میں مسز واٹسن کا بھٹیار خانہ موسوم بہ گلوسٹر ہوٹل۔ اس وقت میں کمرہ نمبر ۷۱ سے جو تہہ خانے میں سڑک کے رُخ واقع ہے اور جس کی کھڑکی کے باہر کوڑے کا ڈرم نظر آرہا ہے، یہ نامۂ شوق آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ میر باقر علی داستاں گو نے کسی غریب مسافر کے سرائے میں جانے اور بھٹیار خانوں سے پالا پڑنے کا حال اپنی داستانی بولی میں لکھا ہے، اس وقت یاد آگیا، لیکن نہیں۔۔۔ یہاں اتنی زدہ کیفیت بھی نہیں، ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔۔۔ یہ سچ ہے کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ یعنی یہ کمرہ وہ نہیں جس کی بُکنگ میں نے کراچی ہی سے خط لکھ کر کرالی تھی۔ بے صبر مسز واٹسن نے وہ کسی اور گاہک کو دے دیا اور دیکھا مُجھے تو چھوڑ دیے مُسکرا کے ہاتھ۔۔۔ یعنی میرا مُنہ تکنے لگیں کہ آپ تو

سچ مچ آ گئے۔ میں نے کہا، ہم بارِ خاطر ہوں تو کہیں اور ٹھکانا کریں، شب باشی کا بہانہ کریں۔ سوچ کر بولیں: اجی نہیں ٹھہریے کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ میری خاطر ان کو اتنی منظور ہوئی کہ اس کمرے سے نوکرانی میری کو لات مار کر نکال دیا۔ میں نے کہا۔۔۔ یہ کیا کیا؟ اس بیچاری کو کیوں نکالا مجھے کہیں اور جگہ مل جائے گی۔ بولی: اجی صاحب آپ پروانہ کیجیے۔۔۔ رقیق القلب نہ بنیے۔ آپ میرے لیے زیادہ اہم ہیں۔ بزنس از بزنس، اس کا کیا ہے، چند دِن میں دھکے کھا کر پھر آ جائے گی۔ کئی بار جا چکی ہے اور آ چکی ہے۔ ہاں تو لایئے ایک ہفتہ کا کرایہ پیشگی۔ "آٹھ پاؤنڈ" آپ نے لندن میں ایشیائیوں سے نسلی امتیاز برتے جانے کی داستانیں سنی ہوں گی اور خبریں دیکھی ہوں گی۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ مسز واٹسن نے میری خاطر اپنی ایک ہم وطن کو چلتا کیا۔۔۔ ہاں آٹھ پاؤنڈ کی بات البتّہ ہے، رنگ و نسل اپنی جگہ، پیسہ اپنی جگہ۔

لندن بالکل ویسا ہی ہے جیسے میں چھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اتّفاقات سنو کہ ۱۹۶۱ء میں بھی ۵ ستمبر کو چل کر ۱۲ ستمبر کو وارد لندن ہوا تھا۔ اب کے بھی ۵ ستمبر کو چلا اور ایک ہفتہ راستے میں گزار کر ۱۲ ستمبر کو یہاں پہنچا۔ اس سال بھی ان تاریخوں کا منگل کا دِن پڑتا تھا اُس کا بھی منگل ہی کا ساتھ ہے۔ پیرس میں مالار ہوٹل میں

میرے کمرے کا نمبر ۱۷ تھا۔ یہاں بھی ۱۷ ہے۔ یہاں میں شام کے جھٹ پٹے میں پہنچا لیکن ہر چیز کچھ مانوس مانوس معلوم ہوئی۔ صُبح دم دیکھتا ہوں کہ یہ تو کوئینز گارڈن کے بالکل ساتھ والی گلی ہے۔ کوئینز گارڈن وہ جگہ ہے جہاں میں اس سال ٹھہرا تھا۔ فقط ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ حضرت نوح ناروی کے مصرع کی پوری واردات ہوئی تھی۔

کہ اُس نے بُلایا، بُلا کر بِٹھایا، بِٹھا کر اُٹھایا، اُٹھا کر نکالا

آپ کو یاد ہو گا، اس سال میرے ساتھ اپنے بنگالی شاعر ابو الحسین بھی تھے۔ ہم دونوں بیلجیئم کا میلہ بھگتا کر یہاں آئے اور سیّد اطہر علی کی مہربانی سے کوئینز گارڈن کے نمبر ۵۰ میں ۳ نمبر کا کمرہ مل گیا تھا۔ ہمارا پروگرام لندن میں فقط آٹھ دس روز رُکنے کا تھا لیکن ہوتے ہوتے پانچ ہفتے گزر گئے حتّٰی کہ یار آشنا پوچھنے لگے کہ میاں ابھی گئے نہیں، کب جاؤ گے؟ بی بی سی کے دوستوں نے ہم سے تقریریں لکھوانا اور نظمیں پڑھوانا بھی بند کر دیا۔ لندن میں دیکھنے کے مقامات بھی ختم ہو گئے۔ ہمارا غیر ملکی زر مبادلہ کا توازن بھی خاصا بگڑ گیا تھا اور ہمارے مالک مکان نے بھی مصنوعی اخلاص برتنا موقوف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم لندن میں تھے، محض ابو الحسین صاحب کی پُر اسرار بیماری کی وجہ سے۔

ابو الحسین نے لندن پہنچتے ہی ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے پتے پوچھنے شروع کر دیے تھے، ایک روز ہم نے گفتگو میں ڈاکٹر گراہم بیلی کا ذکر کیا تو بولے، کس چیز کا ڈاکٹر ہے؟ مُجھے اس کے پاس لے چلونا۔ ہم نے کہا، اوّل تو لسانیات کا ڈاکٹر ہے اور تمہاری بیماری اس سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے بقید حیات نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے دوسرے دوستوں سے رجوع کرنا شروع کیا۔ خصوصاً لندن میں رہنے والے بنگالیوں سے۔ ہمیں نہ ان کے مرض کی نوعیت معلوم تھی نہ ہم نے اس کے متعلّق استفسار کرنا مناسب جانا تھا کہ جانے کون سی اور کیسی بیماری ہو جس کے ذکر سے وہ آپ بھی شرمسار ہوں اور ہمیں بھی شرمسار کریں۔ لیکن جب آٹھ روز گزر گئے اور ہم نے لندن سے آگے چلنے کو کہا تو ابو الحسین بولے۔ میاں تم چاہو تو جاؤ۔ میں چند دِن اور لندن میں رہوں گا۔ علاج کرا کے جاؤں گا۔ آخر ہم نے معافی چاہ کر پوچھ ہی لیا کہ مرض کیا ہے؟ بولے، یہ پرانا مرض ہے۔ پاکستان میں اس کا بہت علاج کرا چکا ہوں لیکن نہیں جاتا۔ پاکستان کے ڈاکٹر، حکیم، وید، ایلوپیتھئے، ہومیو پیتھئے، فٹ پاتھئے سب دیکھ لیے ہیں تو لندن آیا اسی کارن ہوں۔ شاعری کا حیلہ تو بہانہ تھا۔

ہم نے کہا۔ ”کچھ مرض کی تفصیل تو بیان ہو۔“

جوشاندہ

بولے۔ ”جس روز دفتر میں مجھے آٹھ دس گھنٹے مسلسل کرسی پر بیٹھنا پڑے تو پیٹھ میں درد ہونے لگتا ہے۔“

”معمولی یا شدید؟“

”نہیں شدید تو نہیں، میٹھا میٹھا ہلکا ہلکا۔“

”اور وہ مُستقل رہتا ہے؟“

”نہیں، پانچ سات منٹ میں جاتا رہتا ہے۔“

”ہر روز ہو جاتا ہے؟“

”نہیں، بلکہ جس روز آٹھ دس گھنٹے مسلسل بیٹھنا پڑے۔“

ہم نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت سنگین مرض معلوم ہوتا ہے۔ جم کے علاج کراؤ۔ مالش کرائی ہے؟“

”کرائی“

”جوشاندہ پیا؟“

"پیا"

"ٹیکے لگوائے؟"

"لگوائے"

"طاقت کی دوائیں کھائیں؟"

"کھائیں"

"گنڈے تعویذ کیے؟"

"کیے"

"آپریشن کرایا؟"

"کس چیز کا؟"

"دماغ کا، اور کس کا؟ بھلے مانس کیوں ڈاکٹروں کو پریشان کرتے ہو۔ لقمان کے پاس گئے ہوتے لیکن تمہارے مرض کی دوا شاید اس کے پاس بھی نہ ہو۔ یہ مرض لاعلاج ہے۔ اب اپنی زندگی کے باقی دِن جوں توں پورے کرو۔"

ابو الحسین صاحب نے تو نہایت وسیع القلبی سے اجازت دے دی کہ تم چاہو تو جاؤ لیکن یورپ کے کئی ملکوں کا پروگرام باقی تھا اور تنہا آدمی سفر میں زِچ ہو جاتا ہے۔ دو ہوں تو آپس میں دکھ سکھ سہ لیتے ہیں۔ ایک کمرہ لے لینا سستا پڑتا ہے۔ سواری بھی جیسے ایک نے لی، دو نے لے لی۔ کئی بار ایک کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوسرے کو کوئی اور امر دیکھنا ہوتا ہے۔ بہر حال پردیس میں ساتھی بہت غنیمت ہے خواہ وہ ابو الحسین کا سا ہی کیوں نہ ہو۔

آخر یہی سوچا کہ جن لوگوں سے رُخصت ہو آئے ہیں کہ بھیّا کل جا رہا ہوں۔ ان کے سامنے نہ جائیں گے اور لندن کے گلی کوچوں کا گشت جاری رکھیں گے۔ خیر تو اب قصّہ خلد سے آدم کے نکلنے کا سنیے!

وہ رات بڑی سہانی رات تھی۔ ابو الحسین اس روز اپنے ایک دوست کے ہاں مدعو تھے اور انہیں سونا بھی وہیں تھا۔ ہم نے مزے مزے سے ڈھائی شلنگ والا سینما دیکھا اور زمیں دوز ریل پکڑ کو ئینز وے اسٹیشن پر نکل آئے۔ بھوک لگ رہی تھی۔ کسی اور کھانے کا اس وقت سوال نہ تھا۔ کو ئینز وے کے ایک کونے سے وِمپی لے لی۔ کراچی میں ریو سینما کے آگے اور دیگر مقامات پر بھی آپ دیکھیں گے کہ بھینس کے موٹے قیمے کے شامی کباب تلنے والے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ پہنچے، انہوں نے

ایک چھوٹی ڈبل روٹی یعنی بن کا پیٹ چاک کیا، اس میں ایک کباب مع تھوڑے پیاز چٹنی کے رکھا اور آپ کو تھمایا، یہاں خدا جانے اس کا کیا نام ہے۔ لندن میں ہو تو وہی نام پائے اور دو ڈھائی روپے میں بِکے، خیر وہی لے، سامنے کی خود کار مشین میں چھ پنس ڈال دودھ کا ٹھنڈا گلاس بر آمد کیا اور ایک ہاتھ میں یہ ایک میں وہ لے، کچھ گنگناتے، سیٹی بجاتے، گھر کا رُخ کیا۔

پاسبان دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا، اس نے کُچھ کہنے کی کوشش کی۔ ہم نے تیور سے پہچانا کہ سلام کر رہا ہے، خیریت پوچھ رہا ہے لہٰذا نہایت خوش دِلی سے اس کی بھی خیریت پوچھی اور موسم کی خوشگواری سے بھی مطلع کیا لیکن اندر سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ایک دم کو ٹھٹکے، وہاں ایک اوور کوٹ زمین پر پڑا تھا بالکل ہمارے اوور کوٹ کا ہم شکل غور سے دیکھا تو ایک سوٹ کیس نظر آیا۔ یہ بھی اتّفاق سے عین ہمارے سوٹ کیس کے ناک نقشے کا تھا اس کے ساتھ ہی ایک تھیلا ابو الحسین کے تھیلے کے مشابہ نظر آیا اور کتابوں کا ایک ڈھیر۔ اتّفاق کہیے کہ اِن کتابوں میں سے بھی سبھی ہمارے پاس اوپر کمرے میں موجود تھیں۔ قمیضیں ٹائیاں وغیرہ بھی ایک دوسرے پر ڈھیر لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ادھر توجّہ دیتے اور یوں بھی ان چیزوں سے ہمارا کیا تعلّق تھا خیر ہم اوپر کمرہ نمبر ۳ یعنی اپنے غریب خانے پر

پہنچے۔۔۔ اور دروازے میں کنجی گھمائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب کھڑے ہیں سلیپنگ سوٹ پہنے درشتی سے بولے:

"کیا چاہتے ہو؟"

ہم نے کہا۔۔۔ "یہ ہمارا کمرہ ہے۔ آپ یہاں کہاں؟"

انہوں نے کہا:۔ "یہ آج سے ہمارا ہے، ہم نے کرایہ دیا ہے، پوچھ لو پاسبان سے "

اتنے میں پاسبان بھی آن موجود ہوا تھا۔ اس نے بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر تصدیق کی اور کہا۔ "جی ہاں آپ کی میعاد ختم ہوئی، اب یہ اِن کا ہے۔"

"لیکن تمہیں کیا حق ہے، ہمارا کمرہ کسی کو دینے کا۔"

اس نے کہا: "جناب حسبِ قاعدہ آپ کو میعاد ختم ہونے سے دو دِن پہلے مطلع کرنا چاہیے تھا کہ آپ اگلے ہفتے بھی اس میں فروکش رہیں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کھڑے کھڑے خالی کر دیں اور ہمیں کرایہ دار کے انتظار میں جھبنکنا پڑے۔"

ہم نے کہا۔ "تم ہم سے پورے ہفتے کا یعنی پیر تا اتوار کا کرایہ وصول کر سکتے تھے لیکن یوں ہمیں کمرے سے بے دخل کرنے کا اختیار نہ تھا۔"

پاسبان یا نگران جو بھی کچھ اسے کہیے، مالٹا کا رہنے والا تھا اور مالٹا کے رہنے والے پاکستانیوں، ہندوستانیوں سے یوں بھی خار کھاتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "جناب پھر آپ ایسے لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں کہ پورے ہفتے کا کرایہ نہیں دیں گے۔ آپ کو کمرہ مطلوب تھا تو دو روز پہلے نہ کہہ سکتے تھے۔"

یہ بات سچ تھی مگر ہمارا قصور زیادہ نہ تھا۔ ابو الحسین اپنی بیماری کے کارن لندن سے اپنی روانگی ہر روز ملتوی کرتے تھے اور ہم روز کوپن ہیگن کی سیٹ کینسل کراتے تھے اب کے خیال تھا کہ جمعے یا ہفتے۔ حد سے حد اتوار کو ہم کمرہ اور لندن چھوڑ روانہ ہو جائیں گے لیکن وہ نہ ہوا۔ یہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ مالک کسی اور کرایہ دار کو لے آئے گا۔

ہم نے کہا۔ "اچھا ہمیں کوئی اور کمرہ دے دو۔"

انہوں نے کہا۔ "بالکل نہیں کمرہ ہمارے ہاں۔"

ہم نے بہت کہا کہ ہم تمہارے پرانے اور مُستقل گاہک ہیں۔ چار ہفتے سے یہاں مقیم ہیں۔ ہم سے یہ بے رُخی نہ برتو۔۔۔ لیکن وہ خدا کا بندہ نہ پسیجا۔ بولا۔ "کہیں اور ڈھونڈیے۔ یہاں اب آپ کو کمرہ ملنے سے رہا۔"

ہم نے کہا۔ ''میاں ہمارا سامان تو کمرے ہی میں ہے اسے تو نکال لیں۔''

بولا۔ ''جناب کمرے میں نہیں، نیچے سیڑھیوں کے پاس فرش پر ہم نے ڈھیر کر دیا ہے اسے فوراً اٹھوائیے ورنہ ہم کسی چیز کی کمی بیشی کے ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ یہ وقت کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا تھا اور اس خلفشار کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم تنہا تھے۔ ممکن ہے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچتی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ ہاتھ ہمارے خالی نہیں۔ ایک میں ومپی تھی، ایک میں دودھ کی بوتل۔ یہ چیزیں کمرے میں بیٹھ کر کنڈی لگا کر کھانے کی تھیں، لیکن اس بے سر و سامانی میں ان کا کیا کریں؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پاسبان سے کہا کہ بھیّا ایک دو گھنٹے ہمارے سامان پر نظر رکھو، ہم کوئی اور کمرہ تلاش کر لیں تو اٹھائیں۔ وہ کچھ نہ بولا کم از کم معترض نہ ہوا۔

گلی میں نکل کر ہم کو سب سے پہلے ہاتھ خالی کرنے کی فکر ہوئی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تو کچھ نہ کھایا جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے بھی کھانا ممکن نہ تھا۔۔۔ ممکن ہوتا تو خلاف تہذیب ہوتا۔ دو گلیاں چھوڑ تیسری گلی میں کچھ کاریں پارک تھیں ہم نے اُن کی اوٹ جا کر جلدی جلدی ومپی کے پچے کاٹے اور پھر غٹ غٹ دودھ پی گئے۔

پہلی بات یہی سمجھ میں آئی کہ سیّد اطہر علی سے استمداد کریں۔ کم از کم یہ رات اس

کے کمرے کے فرش پر کاٹیں۔ کل مکان تلاش کریں گے۔ اس کا گھر تھوڑی دور تھا۔ گھنٹی بجائی، صدائے بر نخاصت۔ گویا موصوف ابھی باہر سے تشریف نہ لائے تھے۔ آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر گھوم کر پھر گھنٹی جا بجائی۔ پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اب کے ہم نے دوسری گھنٹی بجا کر لینڈ لیڈی کی خادمہ کو بلایا۔ وہ بکتی جھکتی بر آمد ہوئیں اور کہا۔: "کیا بات ہے جی؟"

ہم نے کہا۔ "اطہر کو پوچھتے ہیں۔"

بولیں۔ "پھر ان کی گھنٹی بجاؤ، مجھے کیوں تنگ کرتے ہو؟"

ہم نے کہا۔ "وہ تو ہے نہیں، اجازت ہو تو یہاں ڈیوڑھی میں بیٹھ کر انتظار کر لیں۔ باہر سردی بھی ہے۔"

بولیں۔ "بالکل نہیں، آپ باہر جایئے۔ میں پاکستانیوں کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت بے ڈھب اور بد معاملہ لوگ ہوتے ہیں۔ اطہر آ جائے تو اُس کے ساتھ اندر آ سکتے ہو، لیکن اس کے کمرے میں سونے کی کوشش پھر بھی نہ کرنا۔"

ہم نے لجاجت سے کہا۔ "آج کی رات ہم بے خانماں ہیں اچھا یہ اجازت دو کہ یہ رقعہ

ان کے کمرے میں ڈال آئیں۔ اس کی انہوں نے از راہِ عنایت اجازت دے دی اور ہم نے احوال اپنی بے دخلی کا رقم کر کے رقعہ اطہر کے کمرے میں پھینک دیا۔"

باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ سامنے ہی ہوٹل ہے۔ نام اب اس کا یاد نہیں۔ گھنٹی بجائی تو ایک جلی کٹی چیں بجیں بڑھیا بر آمد ہوئیں، بولیں۔۔۔ "یہ کیا وقت ہے شریف آدمی کو تنگ کرنے کا؟"

ہم نے عمر بھر کی عاجزی اپنے لہجے میں سمو کر کہا، ہم اس وقت بے ٹھکانہ ہیں۔ آدھی شب کا عالم ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سوئیں۔ پھر آخر آپ کی دولت مشترکہ کے آدمی ہیں۔

بولیں "میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ جاؤ بھلے آدمیوں کو بے وقت پریشان نہیں کرتے۔ نہیں ہے جگہ میرے ہاں۔"

ایک اور ہوٹل میں پوچھا۔ "وہاں بھی یہی جواب ملا۔"

ایک فون سے قریب ہوٹل سے بات کی۔ منیجر نے کہا ہمارے ہاں جگہ ہے۔ تشریف لے آیئے۔ جب ہم خوش خوش وہاں پہنچے تو منیجر ہماری جلد کی رنگت دیکھ کر بہت

گھبر ایا۔ بولا۔ ”جناب جگہ تو بالکل نہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”دس منٹ پہلے تم نے کہا تھا کہ ہے۔“

بولا۔ ”جی ہاں، لیکن اس عرصے میں وہ رُک گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر بڑے زور سے دروازہ بند کیا۔

اب کوئی عالم ایک بجے کا ہو گا۔ ہم نے سوچا اب دیکھیں اطہر آیا ہے کہ نہیں؟ گھنٹی بجائی۔ اطہر صاحب بر آمد ہوئے۔ ہم نے کہا۔ ”تُم نے میر ارقعہ نہیں دیکھا تھا؟ مدد کو کیوں نہیں آئے؟“

بولے۔ ”اب تمہارے گھنٹی بجانے پر دیکھا ہے ورنہ یہی خیال کیا کہ یونہی کوئی کاغذ ہو گا۔ اب میری لینڈ لیڈی تو بہت سخت ہے تمہیں میرے کمرے میں گھُسنے نہیں دے گی۔ کہیں اور تلاش کریں۔“

اب ہم دونوں نے ایک دو جگہ کوشش کی لیکن ناکام۔۔۔ آخر انہوں نے کہا۔ ”یہ سامنے والے مکان کے پاسبان سے علیک سلیک ہے اور چونکہ میں یہاں کئی مہینوں سے رہتا ہوں شاید کام بن جائے۔“

ہم نے کہا۔ ''ہم دیکھ چکے اُن کے ہاں بھی مطلق جگہ نہیں۔''

اس کے باوجود ہم نے وہاں جا کے دستک دی۔ پاسبان صاحب نکلے۔ بولے جگہ بالکل نہیں۔ میں اِن صاحب کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اب اطہر نے ان کی خوشامد کی۔ اپنی ہمسائیگی اور ہماری بد حالی کا ذکر کیا اور کہا۔ فقط آج رات کی بات ہے کل یہ انتظام کر لیں گے۔

اس مرد شریف نے کہا۔ نیچے تہہ خانے میں خادمہ کا کمرہ ہے اس میں یہ رات کاٹ لیں۔ کرایہ سوا پاؤنڈ ہو گا۔ لیکن علی الصُبح کمرہ خالی کر کے سامان دفتر میں جمع کرا دیں اور گیارہ بارہ بجے تک اٹھوا لے جائیں۔ ہم نے اور اطہر نے اُن کی انسان دوستی اور نیکی کا صدقِ دل سے شکریہ ادا کیا اور دونوں نے مل کر سامان ڈھویا۔ تین پھیرے ہوئے۔ اطہر سے معذرت کی کہ بھائی تمہیں بے حد تکلیف دی۔ خدا کا شکر کیا کہ چھت تو نصیب ہوئی۔

ارے بھئی یہ خط تو لندھور بمن سعدان کی داستان بن گیا۔ ہم لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ حالانکہ مذکور صرف اس کمرے کا تھا۔ کچھ ایسا بُرا نہیں۔ غسل خانے کمرے میں نہیں لیکن کچھ دور بھی نہیں۔ چولہا کمرے کے کونے ہی میں ہے۔ واش بیسن

بھی جس سے اس وقت بھی ٹپ ٹپ کی سریلی صدا آرہی ہے۔ پانی قطرہ قطرہ گر رہا ہے کیونکہ نل پوری طرح بند نہیں ہوتا۔ کوئینز گارڈن کے جس مکان کا قصّہ میں نے پھیلایا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لو اس کے تعلّق سے ایک اور قصّہ سنو۔ نمبر ۵۰ کوئینز گارڈن میں کل چھ سات کمرے ہوں گے۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ غسل خانہ نیچے گراؤنڈ فلور پر۔ اس غسل خانے کے ساتھ ایک کمرہ ہاؤس کیپر کا اور ایک میں ایک طرحدار اور طرار صاحبہ۔ وہ کیا کرتی تھیں۔ کیا کماتی کھاتی تھیں؟ یہ معلوم نہیں۔ ہاں ایک بار زور زور سے مالکہ مکان کے گماشتہ کے ساتھ لڑتی دیکھی گئی تھیں کہ تم لوگ مجھے بدنام کرتے ہو، جانے کیا سمجھتے ہو؟ خیر۔۔۔ ایک روز بوقت نیم شب اپنے کمرے سے نیچے غسل خانے میں جانے کے لیے زینہ زینہ اُتر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں، کوئی نیم تاریک کاریڈور میں صدر دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ آواز دی کون ہے؟ یہ وہی صاحبہ تھیں۔ زینے کے قریب آئیں تو دیکھا کہ پیے ہوئے ہیں۔ لہٰذا لڑ کھڑا رہی ہیں اور مُنہ میں سگریٹ ہے۔ بولیں ”آپ کے پاس ماچس ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”سوری! نہیں ہے۔“

وہ پھر بولیں۔ ”جناب میں ماچس مانگ رہی ہوں۔“

ہم نے ذرا وضاحت سے کہا۔ ”نہیں ہے ماچس ہمارے پاس۔ کیونکہ ہم سگریٹ نہیں پیتے۔“ یہ کہہ کر غسل خانہ میں چلے گئے۔

غسل خانے میں آدھ گھنٹہ تو لگا ہو گا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ وہ وہیں کھڑی ہیں۔ بولیں:

”پلیز۔۔۔مجھے ماچس ضرور چاہیے۔“

ہمیں احساس ہوا کہ بے چاری کتنی ضرورت مند ہے۔ اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ برسلز سے ایک ماچس بطور سوینئر خریدی تھی۔ ہم نے کہا۔ ”آپ یہیں ٹھہریے، میں اپنے سامان میں تلاش کرتا ہوں۔“

بولیں۔ ”میں آؤں، تلاش میں مدد دوں۔“

ہم نے کہا۔ ”نہیں آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، یہیں ٹھہریئے۔“

اوپر ابو الحسن تو سوئے ہوئے تھے۔ ہم نے سوٹ کیس کے ایک کونے میں ماچس دریافت کر ہی لی اور نیچے آکر ان صاحبہ کو تھما کے اُلٹے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ہمیں تعجّب تھا کہ انہوں نے شکریہ تک ادا نہ کیا۔ بھونچکی کھڑی رہیں۔ خیر ایسا ہوتا

ہی ہے۔ ہم اُوپر آ کے سو رہے۔ دوسرے روز بی بی سی میں اپنے دوستوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کو لطیفہ مل گیا۔ پہلے تو خود ہنسے۔ پھر جو بھی ملتا اس کو سنواتے کہ سنو رات انشا صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ ان سے کل رات ماچس مانگی گئی تھی۔ آخر ہم نے پاکستان سیکشن کی سیکرٹری مس مارجری کی طرف انصاف طلب نگاہوں سے دیکھا۔ ننھی مُنّی سی لڑکی تھی۔ سُن کر کھکھلا کر ہنسی۔ بولی:

"پھر آپ نے اسے ماچس دی۔

ہم نے کہا۔ "ہمارے پاس تھی ایک، برسلز سے خریدی تھی۔"

یک دم سنجیدہ ہو کر بولیں۔ "کیا تم واقعی ایسے ہی بیوقوف ہو۔جی جیسی باتیں کر رہے ہو۔"

اس وقت آپ کے ہاں صُبح دم یعنی دروازۂ خاور کھلنے کا وقت ہو گا لیکن یہاں چونکہ نیم شب کا عالم ہے۔ ایک بجنے کو ہے لہٰذا گڈ نائٹ۔۔۔ باقی دارد۔

قصّہ کچھ دال چپاتی کا

لندن پہنچنے کے بہت دِن بعد تک ہم انگریزی کھانے کو ترستے رہے۔ ہوا یہ کہ جس شام ہم یہاں وارد ہوئے ہوٹل میں ایک پاکستانی صاحب مل گئے بولے چلیے، پہلے آپ کو کھانے کا ٹھکانا بتا دوں۔ ہم نے کہا بسم اللہ، وہ پُر پیچ گلیوں میں لے گئے اور ایک جگہ لے جا کر کہا۔ یہاں آپ کو عمدہ پاکستانی کھانا اور حلال گوشت ملے گا۔ اچھا تو نہ تھا، قیمے میں پانی بہت ڈال رکھا تھا، لیکن خیر۔ دوسرے روز بی بی سی میں ہمارے دوست آصف جیلانی نے بی بی سی کلب میں ہمیں پراٹھا اور کباب کھلائے، تیسرے دِن انعام عزیز کھینچ کے ایک جگہ لے گئے جہاں بھُنا گوشت، مغز اور ماش کی دال، اور بگھارے بینگن وغیرہ سبھی تھے۔ چوتھے دِن بدر عالم صاحب نے مہمان نوازی کا حق ادا کیا اور ہمیں روغن جوش کھلا کر جوش کے روغنی شعر بھی سنائے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یارو چھری کانٹے کی نوبت بھی آئے گی کہ نہیں کہ عبد اللہ ملک اپنے

گھر لے گئے اور کہا۔ ولایتی کھانا کھا کر تم بے مزہ ہو گئے ہو گے، لو آج پاکستانی کھاؤ۔ اب ہم ان سے کیا کہتے۔ بہت رغبت سے ان کی روٹیاں بھی توڑیں۔ پھر سیّد سبط حسن کی ایسٹرن فیڈرل کمپنی نے ایک دعوت کر دی۔ اس میں بھی پلاؤ، بریانی سیخ کباب اور پراٹھے ہی تھے۔ ایک جگہ تو جہاں بدر عالم ہمیں لے گئے تھے۔ بیرے نے کہا۔

"جناب کیا پان نہیں کھایئے گا؟"

ہم نے کہا "پان؟"

بولے "جی ہاں! کیسا کھاتے ہیں آپ برابر کا؟"

بہت دِن سے پان نہیں کھایا تھا۔ اس روز اس کا بیڑا ابھی منہ میں رکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈھونڈنے والے کو پان بخوبی مل جاتے ہیں۔ لیکن سڑک پر پچکاری مارنے کی اجازت نہیں جگہ جگہ لکھا ہے کہ کچرا ڈالنے یا گندگی پھیلانے والے کو دس پاؤنڈ جرمانہ۔

ہمارے ہاں ایک بزرگ کہ اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ایک روز جنیوا کے ہوٹل کے

باہر سیر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ بچّوں نے دیکھ لیا اور پولیس کو رپورٹ کی کہ ایک شخص خون تھوک رہا ہے۔ فوراً کانسٹیبل آئے اور کہا کہ چلو اسپتال۔ یہ بہت بھنّائے! اور انگریزی میں عُذر کرنے لگے کہ میں تو یہ ہوں، وہ ہوں۔ مجھے تم جیل نہیں بجھوا سکتے لیکن جنیوا کے کانسٹیبل انگریزی زبان کیا جانیں؟ اتّفاق سے ایک بھلے مانس کا گزر اُدھر سے ہوا۔ انہوں نے صورتِ حال سمجھی اور سمجھائی اور ان سے کہا کہ پانوں کی ڈبیا نکال کر انہیں دکھایئے۔ بڑی مشکل سے چھٹکارا ہوا۔ لیکن ہوٹل والوں نے ان کے غسل خانے کو بھی رنگین پایا۔ تو بہت جُز بُز ہوئے۔ یہاں تک تو انہوں نے برداشت کیا۔ لیکن ایک روز ان بزرگ کو شک ہوا کہ یہ گوشت جو ہوٹل والے دیتے ہیں شاید ذبیحہ نہیں۔ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہا۔ مجھے اپنا باورچی خانہ دکھایئے۔ وہ ایسا مصفّا اور مُجلّا تھا کہ ہوٹل والے اکثر مہمانوں کو فخر یہ دِکھاتے تھے۔ ان کو بھی لے گئے۔ سارا دودھ کی طرح اسپید۔ انہوں نے کہا کوئی مرغی لاؤ۔ وہ سمجھے یہ سوئٹزر لینڈ کی مرغیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک پلی ہوئی مرغی لا کر انہوں نے دی۔ پاس ہی چاقو پڑا تھا۔ انہوں نے اللہ اکبر کہہ کر اس کی گردن پر پھیر دیا۔ وہ پھڑ پھڑا کر ان کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن ادھ کٹی گردن کے خون کے چھینٹوں سے سبھی کے کپڑے گُلنار ہو گئے سارا باورچی خانہ بھی

رنگین ہو گیا۔ یورپ میں خود مرغی یا کوئی اور جانور ذبح کرنا جرم ہے۔ وہاں بھی یہ اپنی حیثیت کا حوالہ دے کر چھُوٹے لیکن بعد میں اس ہوٹل والے پاکستانی کو دیکھ کر انکار کر دیتے تھے کہ ہمارے ہاں کمرہ نہیں ہے۔

لندن میں کوئی دو سو ہوٹل ہوں گے جن میں دیسی کھانا ملتا ہے۔ ممکن ہے زیادہ

ہوں۔ ان میں سے اکثریت سلہٹ والوں کی ہے۔ کچھ میر پور کے بھی ہیں۔ پھر کچھ ہندوستانی بھی۔

ان ہوٹلوں کے نام عجب ہیں۔ تاج محل، نام کے تو کئی ہیں۔ پھر موتی محل اور ہیرا محل۔ محل کے لفظ کو تابع مہمل جان کر ایک صاحب نے تو تندور محل ہوٹل بھی کھول رکھا ہے۔ ابھی کوئی دِلّی دربار ہوٹل یا اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل البتّہ ہماری نظر نہیں پڑا۔

لندن میں آٹا دال مرچ مسالے ہلدی دھنیا ہر چیز ملتی ہے اور خالص ملتی ہے گھی کی جگہ مکھن ہے اگرچہ بعض شوقینوں کے لیے دکاندار لوگ خالص پنجاب کا گھی بھی منگا رکھتے ہیں۔ اچار بھی ہر طرح کا موجود رہتا ہے۔ پچھلے ہفتے ہم لندن سے باہر لیسٹر اور برمنگھم بھی گئے۔ برمنگھم کے بعض محلوں میں "ایشیا" کے ایڈیٹر حبیب الرحمٰن صاحب ہمیں لے گئے۔ بالکل گوجرانوالے اور سیالکوٹ کا نقشہ پایا۔ ایک سڑک پر تو ستّر فیصد دکانیں پاکستانیوں کی تھیں۔ یونس سویٹ مارٹ سے ہم نے بھی پیڑے اور جلیبیاں کھائیں۔ یہ دکان دین محمد قصائی حلال گوشت والے کی دکان کے عین سامنے ہے۔ یہاں مُستقل رہنے والے پاکستانی بالعموم پاکستانی قصائیوں سے گوشت لیتے ہیں۔ جابجا دکانیں ہیں جن پر لکھا ہے۔

''یہاں حلال گوشت ملتا ہے''

(بعض ہلال گوشت بھی لکھتے ہیں)

لیکن ایک پاکستانی بیگم صاحبہ کا کہنا ہے کہ ہمارے یہ بھائی اوّل تو گوشت مہنگا بیچتے ہیں پھر اس میں پاؤ بھر ہڈّی ضرور ڈالتے ہیں۔ پھر ان کا رویّہ خاصا درشت ہوتا ہے۔ لہٰذا میں تو اب انگریز قصائی کے ہاں سے لینے لگی ہوں۔ سستا ہوتا ہے اور صاف اور عمدہ ہڈّی چھیچھڑے کی مُصیبت بھی نہیں۔

یہاں قصائی کی دکان آئینہ خانہ ہوتی ہے۔ جانوروں کا ڈاکٹر باقاعدہ معائنہ کرتا ہے۔ ہماری طرح رشوت دے کر خانہ ساز اور نہ پڑھی جانے والی جامنی مہر نہیں ٹھونکی جاتی۔ پھر گوشت کے نہایت نفیس پارچے مومی کاغذ میں ملفوف سجے ہوتے ہیں۔ اُن پر اُن کی قسم اور قیمت لکھی رہتی ہے بیچنے والا سپید بُراق ایپرن باندھے ہوتا ہے۔ شیشوں کے دروازے، کھڑکیاں اور ٹھنڈا رکھنے کو فرتج۔ کئی بار تو یہ گوشت کچّا کھانے کو جی چاہتا ہے۔ حلال و حرام کا امتیاز بڑی اچھی بات ہے لیکن اب یہ ہمیں تک رہ گیا ہے۔ لندن میں ہمارے ہوٹل میں ایک صاحب ایک اسلامی ملک کے تھے۔ دو تین روز کو آئے تھے۔ انگریزی نہ جانتے تھے لہٰذا ہمیں ترجمانی کرنی پڑتی

تھی۔ مسز واٹسن نے پوچھا ان کو انڈا اور بیکن دوں؟

ہم نے کہا۔ اے حرّافہ! خبر دار! جیسا ناشتہ ہمیں دیتی ہو اسے بھی دو۔ مسلمان بھائی ہیں۔ اس نے خالی انڈے توس لا دیئے۔ ان صاحب نے ایک روز تو کھا لیے دوسرے روز ہم سے کہنے لگے۔ بڑی بی سے کہو ہمیں خالی انڈوں پر نہ ٹرخائے۔ ان کے ساتھ بیکن بھی دیا کرے۔ جب ہم نے دبے لفظوں میں کچھ کہا تو بخشنے لگے کہ مسلمان کا ایمان تو دِل میں ہوتا ہے، معدے میں تھوڑا ہی ہوتا ہے اور شروع میں سؤر اس لیے حرام قرار پایا تھا کہ گندہ ہوتا ہے اور گندگی کھاتا ہے اب تو دیکھو کس طرح خاص طور پر خوراک کے لیے پالا جاتا ہے۔

ہم نے کہا بابا تو جو جی چاہے کھا۔ ہمیں مت قائل کرنے کی کوشش کر۔ آئندہ ہم تری ترجمانی کریں تو سؤر کھائیں۔

لندن کے ایک اُردُو ہفتہ وار میں ایک پاکستانی مقیم انگلستان نے لکھا ہے کہ ہم پر قہرِ الٰہی نازل ہونے والا ہے۔ وہ اس لیے کہ یہاں آکر پاکستانی بیئر پینے لگتے ہیں۔ قہر الٰہی کی ذمّہ داری ہم نہیں لیتے لیکن شراب کے پرنالے یہاں ضرور بہتے ہیں اگرچہ بہکتے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے میاں بیوی کھانے سے پہلے گھر میں بھی چسکی لگا لیتے ہیں۔

گلی کے کونے کے پب میں بھی پیاس بجھاتے چلے جاتے ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں ٹھنڈی آب وہوا میں خون کو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے اک گونہ بے خودی اس سے ملتی ہے، مَے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو۔ ان شراب نوشوں اور کافروں نے اتنا التزام البتّہ کیاہے کہ کوئی بے روزگار بھی ہو تو بھوکا نہ مرنے پائے۔ اسے اتنا وظیفہ سرکار سے ضرور ملے کہ گزارہ کر سکے۔ مکان کا کرایہ دے سکے۔ کپڑے پہن سکے اور اس کے بچّوں کو دُودھ میسّر آ سکے۔ جتنے زیادہ بچّے ہوں گے، اتنی زیادہ اس کی جان سُکھی ہو گی۔ کام پر لگا ہے تو انکم ٹیکس کم ہو گا۔ بیروزگار ہے تو وظیفہ زیادہ ہو گا۔ ایک صاحب ذکر کر رہے تھے کہ ہمارا ایک کلرک نوکری چھوڑ گیا ہے کہنے لگا جناب ڈیڑھ پاؤنڈ میں ہفتہ بھر نو سے پانچ بجے تک کام مُجھ سے تو نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بیروزگاری کی صورت میں اسے جتنا وظیفہ ہفتے میں مل سکتا ہے، تنخواہ اس سے فقط ڈیڑھ پاؤنڈ زیادہ ملتی ہے۔ پھر کیوں نہ گھر میں پڑا چارپائی توڑے اور معمّے حل کرے۔ ایک مزدور کا پچھلے دِنوں ٹیلی وژن انٹرویو آیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کام کیوں نہیں کرتے؟ بولا۔۔۔ جناب کام کروں تو بیوی بچّوں کو کیا کھلاؤں؟ تفتیش پر معلوم ہوا کہ آٹھ بچّے ہیں۔ اگر کام کرے تو سولہ پاؤنڈ ہفتہ پائے گا۔ بیروزگاری کا وظیفہ ستائیس پاؤنڈ فی ہفتہ بن جاتا ہے۔

کچھ چکھوتیاں کلچر کی

ہماری ڈائری سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ ہمارا سارا وقت یورپ میں مکان کی تلاش یا غسل خانوں کی پیمائش میں گزرتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جہاں رہنا چار دِن ہو اور ان میں سے دو آرزو میں کٹ جائیں دو انتظار میں۔۔۔ وہاں اور کیا محلِ گفتگو ہو سکتا ہے گیارہ بارہ دِن مسز واٹسن کے بوسیدہ تہہ خانے میں بسر کرنے کے بعد یہ کمرہ ملا ہے۔ علیحدہ خواب گاہ علیحدہ نشست گاہ، علیحدہ غسل خانہ بھی جو فی زمانہ نہیں ملتا۔ کرایہ اس سے پونے دو گنا لیکن خیر۔۔۔ ہمارا آدھا وقت تو غسل خانے میں صرف ہو جاتا ہے مَن کا میلا پن دور نہیں کر سکتے تو تَن تو اُجلا رہے۔

ان مکروہاتِ دنیوی سے فرصت پا کر ہم کلچر کی چکھوتیاں بھی کرتے رہے ہیں۔ برٹش میوزیم میں گئے۔۔۔ کیا پرانی پرانی چیزیں بھر رکھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی مورتیاں، پرانے وضع کے مٹکے اور لوٹے۔ مٹیالی کیڑے کھائی کتابیں۔ ان سے کہیں

بہتر چیزیں تو یہاں بازار کی ہر دوکان میں مل جائیں گی، اور نئی۔ اس کے کتب خانے کو بھی ہم نے دیکھ ڈالا۔ وہی وہانوی کا کوئی ناول نہ ملا۔ کارڈ بنوانے گئے تو ایک ترش رو اسسٹنٹ نے کہا۔ کبھی پہلے بھی ممبر رہے ہو؟ ہم نے کہا، ہاں آج سے چھ سال پہلے ستمبر میں بنا تھا۔ وہ چھت پر گیا اور ہمارا کارڈ نکال لایا۔ کارڈ بنانے والا بہت خوش دل اور علم کی قدر کرنے والا تھا۔ اس نے ہماری علمیت کو ہمارے چہرے ہی سے بھانپ لیا اور ہمارے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا۔ ہم آبدیدہ سے ہو گئے کہ موتی کی قدر سمندر سے نکل کر اور ہیرے کی قدر کان سے باہر آکر ہی ہوتی ہے۔

مصر کی قدیم تہذیب کا ہم نے بہت شہرہ سُنا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ولادتِ مسیح سے ہزار دو ہزار سال پہلے تہذیب کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اہرام بنائے۔ ممیاں بنائیں اور دفن کیں اور نہ جانے کیا کیا کیا۔ برٹش میوزیم کے کئی کمروں میں اس تہذیب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں جن میں بادشاہوں اور پروہتوں کے علاوہ ان کی روزمرہ زندگی بھی کھلونوں اور ماڈلوں کی شکل میں دِکھائی دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم تو ذرّہ بھر متاثر نہیں ہوئے۔ ان کے تین ہزار سال پہلے کے آلاتِ زراعت دیکھے۔ کوئی کمال نہیں ویسے ہی ہیں جیسے آج کل ہم استعمال کرتے ہیں۔

لوہاروں اور بڑھئیوں کے ہتھوڑے اور تیشے بھی ایسے ہی ہیں جو پاکستانی دیہات میں

مستعمل ہیں۔ لباس کا بھی ایسا زیادہ فرق نہیں۔ زمیں سے پانی نکالنے کے طریقے رہٹ اور ڈھینگلی وغیرہ ضرور ہمارے آج کل کے دیہاتی طریقوں سے ذرا بہتر ہیں لیکن ایسا زیادہ فرق نہیں کہ اس پر کتابیں لکھیں۔ قدیم مصر کی کھدائی کرنے والوں نے شاید ہمارا ملک نہیں دیکھا، ورنہ انہیں زمین کھودنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ زمین کے اوپر ہی یہ ساری چیزیں اتنی افراط میں مل جاتیں کہ ایک چھوڑ دس میوزیم آباد کر لیں۔ اہرام ہم نے ابھی نہیں دیکھے، انشاء اللہ اسی سفر کے دوران دیکھیں گے لیکن تصویر سے تو یونہی نکیلے تکونے مینار نظر آتے ہیں۔ سُنا ہے بیس بیس تیس تیس سال میں بنے ہیں۔ یہ بھی کوئی کمال نہیں ہمارے ہاں قائدِ اعظم کا مقبرہ بھی دس سال سے بن رہا ہے اور کچھ عجب نہیں مدّت نہیں مدّتِ تعمیر میں ہم اہرام کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ اس زمانے کے مصری نہ ٹائی لگاتے تھے، نہ سوٹ پہنتے تھے اور یہاں تک دریافت ہوا ہے کہ انگریزی تک نہ بولنا جانتے تھے۔ پھر بھی ہمارا ذکر کہیں نہیں اور ان کی تہذیب کا غلغلہ ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

ہمیں سر سیّد احمد خاں کے ایک رسالے کی تلاش تھی جو انہوں نے ہندوستان کے قدیم دیہی نظام پر لکھا تھا۔ سر سیّد کی تالیفات میں اس کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ خیر وہ

مل گیا۔ لیکن ہم نے فہرست میں دیکھا کہ مصنّف کا نام احمد خاں درج ہے۔ ''احمد خاں، سیّد۔'' غالبؔ کو بھی ہم نے غالبؔ کے تحت نہیں بلکہ اسد اللہ خاں کے تحت پایا۔ لکھا تھا: ''اسد اللہ خاں، مرزا'' آگے چل کر لکھا ہے کہ غالبؔ بھی کہلاتے تھے۔ فہرستیں بنانے والے انگریزوں کی دیدہ ریزی کی پھر بھی داد دیجیے، کیونکہ ان کے ہاں کتاب پر سیدھا سیدھا نام لکھنے کا رواج ہے، ولیم شیکسپیئر۔ ایچ جی ویلز، جارج برنارڈ شا وغیرہ۔ یہاں ہم نے اُردُو الف لیلہ کے پرانے نسخے نکلوائے تو ایک پر مؤلف کا نام یوں لکھا پایا:۔

''تالیف ناظم و ناثر بے مثال بذلہ سنج نازک خیال جلا بخش اُردُو زبان اعجاز بیان جناب میرزا رجب علی بیگ سرور۔'' ہم تو خیر پہچان جاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں خود اپنے نام کے ساتھ علامہ یا ناخدائے سخن وغیرہ لکھنے کی روایت ہے لیکن ایک انگریز کا اس میں غوطہ لگا کر صحیح نام نکال لینا کمال کی بات ہے یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کا نام فہرست میں ب کی تختی میں یوں ہوتا ''بذلہ سنج نازک خیال'' جو علی بیگ سرور بھی کہلاتے تھے، وغیرہ۔

خیر موصوف نے جس طور پر آغازِ داستان کیا ہے وہ بھی سُننے کے لائق ہے۔ یہاں سے یہ کج مج زبان، پنبہ در دہان، آوارۂ چار سو، سرمۂ حیرت در گلو، خزاں دیدہ چمن،

گم کردہ وطن، یارو دیار سے دور مرزا رجب علی بیگ سرور، سخن فہم قدر دانوں کی سمع خراشی، اپنے زخم جگر پر نمک پاشی کرتا ہے۔۔۔ آگے توضیح کی ہے کہ ترجمہ تو الف لیلہ کا اُردُو میں تھا لیکن سیدھا سیدھا عام فہم زبان میں تھا۔ ایک رئیس نے فرمائش کی کہ بابا مجھ سے یہ نہیں پڑھا جاتا، اسے مسجع اور مقفی نثر میں دوبارہ لکھو۔ اس فقیر نے اس فرمان کو واجب تعمیل جانا۔۔۔ کتاب کے آخر میں ہیچمدان سراپا عیوب محمد یعقوب سخنور فصیح اللسان محمد صادق خاں اور جناب منشی دھنپت رائے محقق کے لکھے ہوئے قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

میرزا حیرت نے جو الف لیلہ ترجمہ یا تالیف کی اس کی پیشانی پر لکھا ہے۔ الف لیلہ نثر بطرزِ ناول۔ یہ اس زمانے کے آدمی تھے جب پرانی اُردُو میں نئی روشنی کے پیوند لگ رہے تھے۔ اس میں ہر جگہ گفتگو مکالموں کی شکل میں ہے۔ اندرون سرورق ایک طرف تو ناثر عدیم النظیر و ناظم فقید المثال حضرت مولوی محمد اقبال حسین المتخلص بہ عاشق دام فیضہ، کے دیوانوں اسرار عاشق اور افکار عاشق کا اشتہار ہے۔ جن کو معانی تغز کا دفتر اور محاورات اردوئے معلیٰ کا مخزن کہا گیا ہے۔ دوسری طرف کتب زیر طبع میں لندن کی مسیں، پیرس کی مسیں، برلن کی مسیں کے نام درج ہیں۔ ؏ ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے۔۔۔ انگریزی سے خوشہ چینی کی بھی تو کیا

کی۔

میرزا حیرت کے مسدّس حیرت کا اشتہار بھی دیکھا۔ ”اس مسدّس میں مولانا حالی کے مسدّس کی تردید بڑی لیاقت سے کی گئی ہے۔ جس زبان پر ان کو بڑا ناز تھا۔ اس کو دہلی کے محاورے کے خلاف ثابت کر کے دکھایا ہے۔“ ہائے یہ اگلے وقتوں کے لوگ جن میں سے کچھ آج بھی باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں فنّی کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ ایک کا اشتہار دیکھئے۔ ”رسالہ کبوتر بازی مع کھیل بلبل“ از مرزا محمد اختر۔ کمپیوٹر تو بڑی بات ہے اگر اس ماحول میں پلے ہوؤں کی عقل بائیسکل کو دیکھ کر حیران رہ جائے تو قابل معافی ہیں۔

آج کل مارکس کی صد سالہ برسی پر یہاں برٹش میوزیم میں مارکس کی کتابوں کے پرانے ایڈیشنوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ ان کے خطوط بھی انگریزی اور فرنچ میں لکھے ہوئے رکھے ہیں۔ مارکس بہت دِن لندن میں رہے اور امریکہ کے انگریزی اخباروں کے نامہ نگار تھے۔ زیادہ وقت یہی برٹش میوزیم کے دار المطالعہ میں گزارتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ انہی کی تحریریں انگریزوں اور امریکیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکالیں گی۔

ہاں ہم نے اس باکمال سر لارنس اولیور کا ایک کھیل بھی دیکھا۔ سعید جعفری ایک ذہین نوجوان یہاں اسٹیج پر نام پیدا کر رہے ہیں۔ وہ سٹرنڈبرگ کے ڈرامے "رقص موت" کے ٹکٹ کہیں سے لے آئے، ورنہ تو اگلے چار ماہ کے لیے ساری سیٹیں بُک تھیں۔ اداکاری کیا تھی، اعجاز تھا اعجاز۔ یہ کھیل وقفے وقفے سے اولڈوک تھیٹر میں ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ گزشتہ مئی میں سر لارنس کے پِتّے کا آپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی ہفتے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ لیکن ان ہی دِنوں کی منڈلی کے ایک دو کھیلوں کی ریہرسلیں ہو رہی تھیں۔ موصوف اوپر کی منزل سے کھڑکی کے راستے نکل، پائپ کو پکڑ کر اتر آئے اور آج تک فرار ہیں۔

فلمیں ہم اپنے وطن میں بھی عموماً یا تو کارٹون دیکھتے ہیں یا لارل ہارڈی سے رغبت رکھتے ہیں۔ سو یہاں کے کلاسیک سینماؤں میں ہمارا یہ حال ہے کہ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اور پھر باادب باملاحظہ ہوشیار۔ اوپر کی آنکھیں اوپر، نیچے کی نیچے۔ ہم نے "فینی ہل" بھی دیکھی۔ رسوائے زمانہ فحش کتاب کی فلم، باہر لکھا تھا "خاص برائے بالغاں" لیکن خیر ہمیں کسی نے نہ روکا۔ ہم اس فلم کو دیکھ کر پہلے ہنسے پھر روئے۔ کیونکہ اس میں تو فینی ہل بالکل نیک پروین ہے۔ جتنے لوگ اسے گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی آبرو پر حملے کرتے ہیں ان سب کو وہ مردانہ وار پچھاڑ

دیتی ہے۔ انجام بالکل ہماری فلموں کا سا ہے۔ آخری سین میں اس کا نکاح گرجا میں ایک اوباش سے کیا جارہا ہے کہ ہیرو یعنی بی بی کا اصلی اور مخلص عاشق زار دروازے توڑ کر اندر آتا ہے اور ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے۔ "یہ شادی نہیں ہوسکتی" اور آخر وہ باعصمت خاتون اپنے پاک باز شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے چلی جاتی ہے۔ اس سارے قصّے میں فحش صرف ایک چیز لگی۔ وہ گالیاں جو فلم دیکھنے والے بالغ اپنے پیسے برباد ہونے پر سینماوالوں کو دیتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اس فلم کا سیناریو کسی وکٹورین ادیب سے لکھوایا گیا ہو۔ بلکہ کچھ عجب نہیں ملکہ وکٹوریہ نے خود لکھا ہو۔ یہ فلم توشِیر خوار بچّوں تک کو آسانی سے دِکھائی جاسکتی ہے۔

ٹاور سے موم گھر تک

تنہائی، تنہائی، اسّی نوّے لاکھ بلکہ شاید کروڑ سے زیادہ آبادی کے شہر میں تنہائی! لیکن تنہا گریستن میں ایک مزا بھی ہے تبھی تو غالبؔ نے اس کی تمنّا کی تھی کہ

"رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

دُعا انھوں نے شاید اپنے لیے مانگی تھی، پوری ہمارے حق میں ہوئی۔ غالبؔ نے بے در و دیوار سا اِک گھر چاہا تھا۔ پچھلے ہفتہ تک ہمارا جو کمرہ رہا ہے۔ اس کا ناک نقشہ اس سے چنداں مختلف نہ تھا۔ غالبؔ کو یہ بھی حسرت تھی کہ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو۔ ہمسایہ تو خیر بے شمار ہیں۔ لیکن بڑے شہر کے ہمسائے کیا۔ برسوں رہ کر ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا تو درکنار، ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں ہو پاتے۔ ہم زبانی کا یہ ہے کہ ہمارے ہوٹل میں قریب قریب سبھی افریقی ہیں یا پھر ایک امریکن لمڈا ہے۔ ناشتے پر گڈ مارننگ، گڈ مارننگ ہو جاتی ہے

اور بس۔ غالبؔ صاحب کو یہ بھی آرزو تھی کہ پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار۔ سو بر سرِ اولاد آدم یہ بھی گزری۔ ہم کھانسی، بخار، زکام میں ڈیڑھ دِن تک اپنے کمرے میں پڑے رہے۔ کسی نے نہ پوچھا کہ بھیّا کیسے ہو؟ آخر ہاؤس کیپر کے کہنے پر سینٹ میری اسپتال کے آؤٹ پیشنٹ ڈیپارٹمنٹ میں گئے۔ انہوں نے کہا فلاں سڑک کے فلاں کوچے میں ڈاکٹر ہارٹ کے پاس جاؤ اور یہ پرچی دے دو۔ وہ مسیحائی کریں گے۔ وہاں پہلے ہی پندرہ آدمی انتظار کر رہے تھے اور اپنی اپنی باری پر ڈاکٹر سے پوچھتے تھے کہ آخر اِس درد کی دوا کیا ہے؟ ہمیں بھی انہوں نے ایک منٹ میں بھگتا دیا۔ یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔ کیونکہ ہمیں ذرادِ لجمعی سے عرض حال کرنے کی عادت ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیا بیماری ہے؟ کھانے میں کیا کھائیں اور کس شے کا پرہیز کریں۔ کھچڑی ہمیں پسند نہیں، کچھ اور بتائیے۔ کیا دہی بڑے، ماش کی دال اور بڑے گوشت کے کباب کھا سکتے ہیں؟ دِن میں کئی بار دوا لینی ہے وغیرہ۔۔۔ جس ڈاکٹر کو اتنا کچھ سُننے کا یارانہ ہو اس کے پاس ہم جاتے ہی نہیں۔ لیکن یہ معاملہ پردیس کا تھا۔ اس مرد متمکن نے پرچی پر کچھ لکھ دیا کہ کسی کیمسٹ کے پاس چلے جاؤ۔ کیمسٹ نے ایک پچکاری سی دی کہ منہ کھول کر گلے میں مارو۔ ہم نے کہا۔ دِن کئے بار، اور اپنے گلے میں یا کسی اور کے۔۔۔ فرمایا یہ تو ڈاکٹر سے پوچھنا تھا حضرت۔

ہم نے کہا، پیسے؟ بولے پیسے کچھ نہیں۔ اس ملک میں علاج معالجہ مُفت ہے۔ مایوس اور غیر مایوس العلاج ہر قسم کے مریضوں کا۔

ہمیں یہ بات معلوم ہوتی تو ہم اب تک کئی بار بیمار پڑ چکے ہوتے۔ امریکہ میں تو ہر چیز کی طرح علاج بھی اتنا مہنگا ہے کہ اس کے لیے جان بیچنی پڑتی ہے۔ اسی لیے بہت سے امریکن اپنی پیچیدہ بیماریوں کے علاج کے لیے ٹورسٹ بن کر انگلستان آ جاتے تھے۔ یہاں اسپتال میں داخل ہو جاتے اور مزے کرتے۔ کرایہ وغیرہ دے کر بھی امریکہ کے مقابلے میں بہت سستا رہتا تھا۔ اب شاید کچھ پابندیاں لگ گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسی بیماری کا علاج مُفت ہو گا جو یہاں آ کر لگی ہے یہ نہیں کہ آپ باہر سے بیماری لے کر آئیں۔ ہم بھی اپنی بیمارئ دِل اور دردِ تنہائی کا علاج یہاں کرانا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی یہی قباحت لگی ہے کہ یہ آزار پاکستان سے ہم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی دوا کرنے سے انکار کر دیا۔

ذکر تنہا گریستن کے مزے کا تھا۔ آج کا لیجیے۔ صُبح نکل گئے۔ صُبح سے ہمارا مطلب ہے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کیونکہ نہ سیکھے ہم نے لندن میں بھی آداب سحر خیزی۔۔۔ آدھی رات سے کچھ پہلے واپس آئے۔ آج ہفتے کا دِن تھا۔ دفتر آج بند رہتے ہیں۔ کوئی کارِ منصبی تھا نہیں۔ لہٰذا لندن ٹاور کا رُخ کیا۔ ٹاور ہم نے ۱۹۶۱ء میں
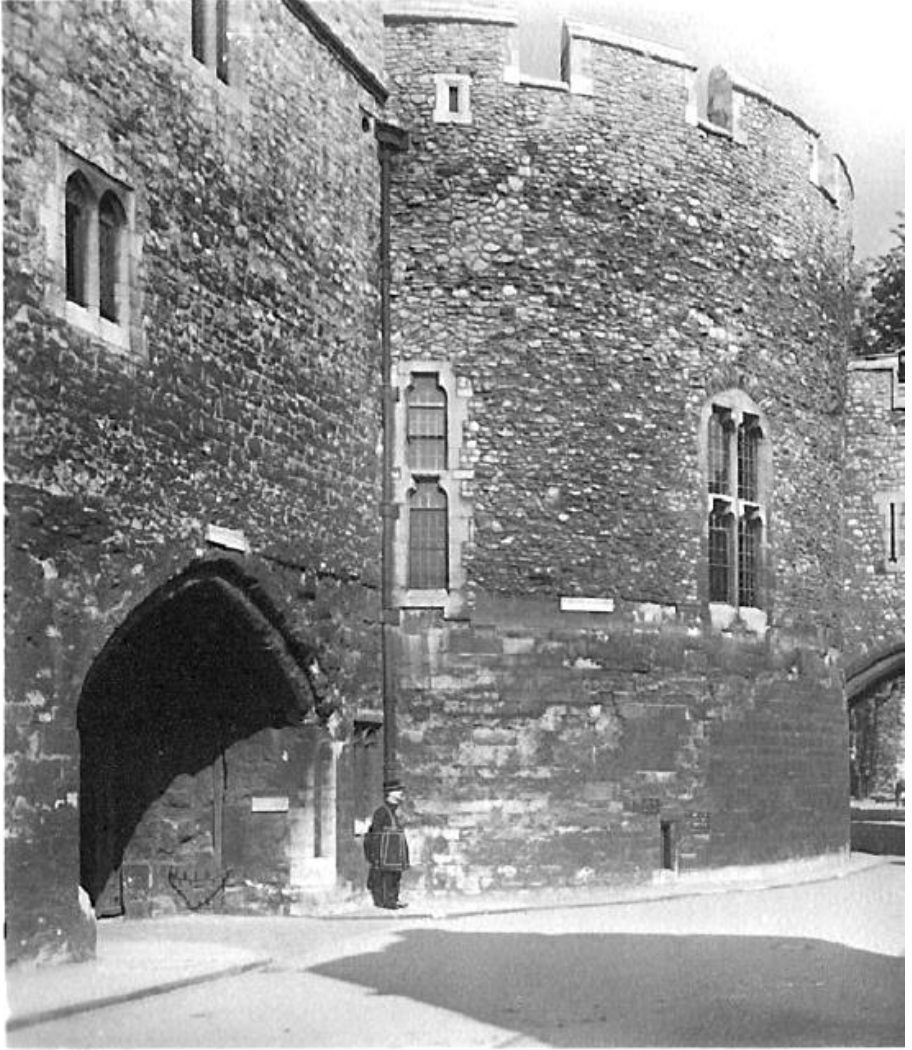
بھی دیکھا ہے لیکن اس میں ایک عجیب آسیبی کشش ہے۔ اس کی زیادہ عمارتیں
تیرہویں صدی کی ہیں۔ بعض اس کے بعد اور اس سے پہلے کی بھی۔۔۔ یہ عجیب

عبرت ہے۔۔۔ کتنے ہی بادشاہوں اور ملکاؤں اور امیروں نے اِن بُرجوں میں اسیری کے دِن گزارے اور پھر اکثر یہیں جلّاد کے کلہاڑے کے سپرد اپنی گردنیں کیں۔ وہ جگہ احاطے کے اندر زنجیروں سے محفوظ کر کے الگ کر دی گئی ہے۔ جہاں ملکہ این بولین (ہنری ہشتم کی دوسری بیگم) اور ملکہ کیتھرائن ہیوارڈ (انہی بادشاہ سلامت کی پانچویں بیوی) لیڈی جین گرے، دو تین مشہور نوّابوں اور نوّاب زادیوں کے سر قلم کیے گئے۔ بلکہ این بولین سے ایک رعایت البتّہ برتی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرا سر کلہاڑے سے نہیں تلوار سے قلم کیا جائے چنانچہ اس کے لیے خاص طور پر تلوار منگائی گئی۔

ایک امیر لارڈ اسپنگر نام کے ڈیوک آف گلوسٹر کے درباریوں میں سے تھے۔ نہایت منتظم مانے جاتے تھے۔ ان سے کوئی قصور ہوا تو آقائے ولی نعمت نے کہا، جناب لارڈ صاحب، آپ سے زیادہ رموزِ مملکت کون جانتا ہے۔ آپ کے جرم کی سزا قاعدے سے کیا ہونی چاہیے۔ اس نے کہا جناب اس کی سزا تو از روئے قاعدہ گردن مارنا ہے۔ چنانچہ قانون کا تقاضا پورا کیا گیا۔

ان بُرجیوں میں ہر ایرا غیرا قید ہونے یا گردن کٹوانے کا شرف حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سعادت فقط شاہی خاندان کے لوگوں یا امراء کے حصّے میں آتی تھی کیونکہ جیل کا سارا خرچ مقدمے کا خرچ۔ حتیٰ کہ جلّاد کی فیس، کلہاڑے اور لکڑی کے کندے کا خرچ بھی مجرم یا قیدی ہی کے ذمّے ہوتا تھا۔ داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ کو بابِ غدّاراں کی چوڑی محراب ہے۔ دریائے ٹیمز سے ایک خندق یہاں آتی تھی اور قیدیوں اور کُشتہ ہونے والوں کو ٹیمز کے راستے اسی محراب کے نیچے سے یہاں لایا جاتا تھا۔ اس کے عین سامنے اسی زمانے کا خونی برج ہے۔ کیسے کیسے سرفراز ان دونوں دروازوں کے نیچے سے گزرے تھے۔ سولھویں صدی میں ڈیوک آف بکنگھم، ملکہ این بولین، کرامویل، ارل آف ایسکس، ملکہ کیتھرائن ہیوارڈ، ڈیوک آف سمرسٹ، لیڈی جین گرے، ڈیوک آف من متھ اور نہ جانے کون کون خود

ملکہ الزبتھ اوّل کچھ دِن یہاں قید رہیں۔

خونی برج کے اوپر کے کمرے میں سر والٹر ریلے نے اپنی اسیری کے بارہ سال گزارے۔ اس کا پلنگ، اس کی کرسی دونوں موجود ہیں۔ یہیں اس نے تاریخِ عالم لکھی جس کا پہلا ایڈیشن اسی کمرے میں دھرا ہے۔ اوپر ذرا سی جگہ ہے جہاں اسے چند قدم ٹہلنے کی اجازت تھی اور اب تک والٹر ریلے واک کہلاتی ہے۔

اس اول العزم کا آخر حکم شہنشاہی سے ۱۶۱۸ء میں سر تن سے جُدا ہوا۔ اس احاطے میں مرنے والیوں میں سے ایک بی بی خاص جرأت والی تھیں۔ ان کو جرم بے وفائی میں جلّاد کے سپرد کیا گیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے پہلے اعلان کیا کہ بے شک میں ملکۂ انگلستان کے طور پر مر رہی ہوں لیکن یہ میرے لیے کوئی ذریعۂ عزّت نہیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ سرمایۂ افتخار اپنے یار کی محبوبہ ہونا ہے۔ ان کا آشنا بھی اسی چہار دیواری میں اذیّت کی موت مرا۔

ٹاور کے ایک طرف کی عمارت میں اسلحہ کا میوزیم بھی ہے۔ جنگجوؤں کے خود، زرہ بکتر اور چار آئینے تو ہر جگہ دیکھے ہیں۔ گھوڑوں کے زرہ بکتر بھی کئی جگہ نظر آئے لیکن ہاتھی کا زرہ بکتر یہیں دیکھا۔ پورا ہاتھی لوہے کی زرہ میں رہتا تھا۔ یہ زرہ کلایو

صاحب ہندوستان سے لائے تھے اور خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ پلاسی میں نوّاب سراج الدّولہ کی فوج کے کسی ہاتھی کی زینت رہی ہو گی۔ بہت سے ہتھیار اور زرہیں یہاں ساختہ لاہور ہیں۔ ایک دو ساختہ سندھ بھی۔ ہتھیاروں میں شمشیریں، خنجر، پیش قبض، قرولیاں، بھانت بھانت کے تحفے ہندوستان کے یہاں دیکھے۔
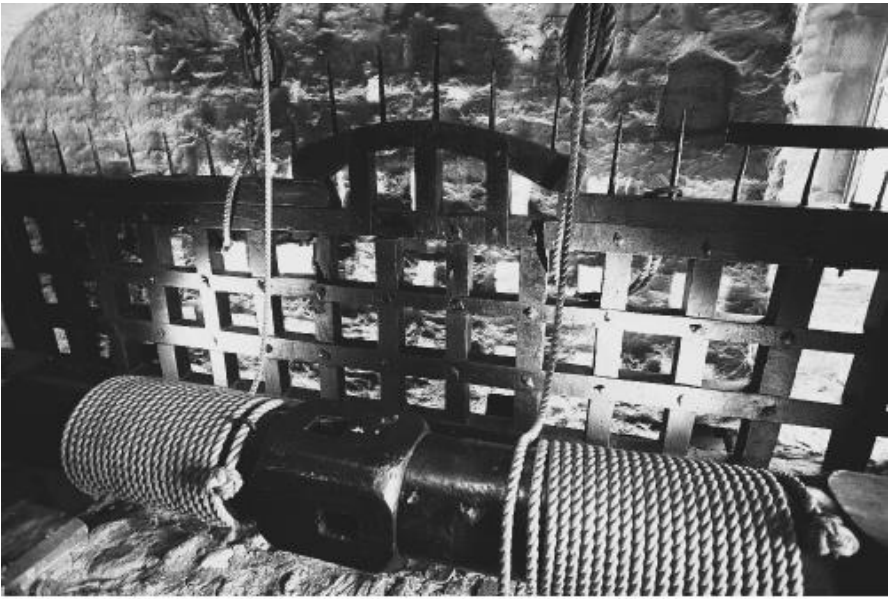
خونی دروازے کی پُلی

ٹاور آف لندن کے کوّے بھی مشہور ہیں۔ یہ کوّے ایک خاص نسل کے ہیں اور فقط ان برجوں پر نظر آتے ہیں۔ کئی صدیوں سے یہ مشہور چلا آرہا ہے کہ جس روز یہ

ختم ہو گئے اسی روز ٹاور گر جائے گا اور سلطنت انگلشیہ ختم ہو جائے گی۔ سلطنت انگلشیہ کے ختم ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی ہے یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن کوّے بہر صورت زندہ ہیں اور وہائٹ ٹاور بھی سلامت کھڑا ہے۔

باقی دِن ہم نے مادام تساد کی مومی شبیہوں کی گیلری اور ان کا چیمبر آف هاررز یعنی ایوانِ دہشت دیکھنے میں گزارا۔ یہ بیکر اسٹریٹ میں ہے اور اس میں موت کی سزا پانے والے مجرموں کے پُتلے کھڑے ہیں۔ یہاں عجب دھوکا ہوتا ہے۔ اندر داخل ہو کر ہم نے گارڈ کے سپاہی کو ٹکٹ دکھایا تو اس نے توجّہ ہی نہ کی۔ معلوم ہوا موم کا

ہے۔

اوپر چڑھے تو ایک پتلا بالکل انسان کی صورت میں کھڑا تھا۔ ہم نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو بولا۔ کیا کر رہے ہیں جناب، آئینہ خانے کی گیلری میں ہم نے ایک صاحب کو دیکھا کہ جس طرف کو ہم جاتے ہیں اسی طرف کو وہ آتے ہیں۔ آخر ٹکرا گئے۔ ہم نے کہا۔ سوری! لیکن شیشے کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ تب معلوم ہوا یہ تو ہم خود ہی تھے، ہمارا عکس ہی تھا۔

لندن میں میوزیم ایک نہیں، بہت ہیں۔ ایک میوزیم سائنس کا ہے، ایک نیچرل ہسٹری کا جس میں جانوروں کے ڈھانچے رکھے ہیں، بعض پودے مچھلیاں، سیب ڈھانچے وغیرہ لاکھوں سال پرانے ہیں۔ ایک آٹھ فٹ لمبا کچھوا (مردہ ڈھانچہ) بھی نظر آیا۔ جو کوہ شوالک کے دامن سے پکڑا گیا تھا۔ پرانے جانوروں میں بعضے تو بارہ بارہ چودہ چودہ سو من کے تھے۔ انسان ان کے سامنے کل کا بچّہ ہے۔ اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دِن کی یعنی فقط تیس لاکھ سال بتائی جاتی ہے۔ جب کہ مچھلیاں ۵۰ کروڑ سال پہلے موجود تھیں اور پرندے ۱۴ کروڑ سال پہلے۔ دودھ دینے والے جانوروں میں بھی انسان سب سے پھسڈی ہے کیونکہ دوسرے جانور بیس کروڑ سال پہلے وجود میں آ گئے تھے، جانے اتنے بہت سے جانوروں کا دُودھ کہاں جاتا ہو گا۔ کہاں

بِکتا ہو گا۔ کون ان میں پانی ملاتا ہو گا۔ کیونکہ انسان اس زمانے میں نہیں تھے تو گوالے بھی نہیں ہوں گے۔

نیچرل ہسٹری میوزیم کے ایک بر آمدے میں ایک درخت کا تنا پڑا نظر آیا۔ یہ اتنا پرانا تو خیر نہیں کہ آثارِ قدیمہ والوں کی توجّہ کے قابل ہو، تاہم ہماری عقل اسے دیکھ کر اور یہ جان کر حیران ہوتی کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب روم اپنے عہد زوال میں تھا تو یہ پودا ۴۳۱ سال کا تنا درخت تھا۔ نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ منوّرہ ہجرت کی تو ۶۵ سال کا تھا۔ برطانیہ کا مشہور بادشاہ الفریڈ اعظم تخت نشین ہوا تو یہ بابائے درختاں زندگی کی تین صدیاں پوری کر چکے تھے۔

مشہور پُل لندن برج جو اب ڈھا کے دوبارہ بنایا جانے والا ہے، اس درخت سے عمر ۴۵۷ سال چھوٹا ہے۔ میگنا کارٹا پر دستخط ہونے کے وقت یعنی ۱۲۱۵ء میں اس کی عمر ساڑھے چھ سو برس کی تھی۔ شیکسپئر کے مرنے کے وقت ۱۰۶۹ سال اور لندن کی مشہور آگ لگی تو یہ بزرگ گیارہ سو سال کے ہو چکے تھے۔

ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے معمّر درخت ہیں لمبی لمبی داڑھیوں والے، لیکن یہ درختوں کا سر سیّد یا بابائے اُردُو ان سب کا رشتے میں دادا رہا ہے۔ افسوس اس نے

ابھی اپنی عمر عزیز کے ۱۲۳۵ سال پورے کیے تھے کہ کسی ظالم نے ۱۸۹۲ء میں اُس پر آرا چلا دیا:

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

گورے دیکھے، کالے دیکھے

لندن دیکھا، لندن والے دیکھے، گورے دیکھے کالے دیکھے، ہاں دوستو! کالے، لیکن سچ مچ کے کالے، چونچ بھی کالی، پر بھی کالے۔ گو ہمیں بھی دعویٰ روسیاہی کا ہے لیکن فردا کی تقدیر معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے ہاتھ میں ہے۔ احساسِ کمتری یعنی چہ؟ ہمیں تو اپنے ان بھائیوں میں صاف احساسِ برتری دکھائی دیتا ہے۔ لندن میں بیرونی طالبِ علموں میں دیکھو یا گلیوں، کوچوں میں کام کرنے والوں کو، ٹیوب میں، بس میں، فلیٹ میں، دکان میں، ہر جگہ گورے کے ساتھ کالا نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ تین میں ہیں یا تیرہ میں ہیں۔ ہیوں میں ہیں یا شیوں میں۔ گورا ہمیں گورا نہیں جانتا خواہ ہماری رنگت اس سے زیادہ ہی سُرخ و سپید کیوں نہ ہو، جنوبی افریقہ میں الگ بنچ پر بٹھائے گا۔ کالوں میں ہماری گنتی ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ اصل کالے اس وقت تک مارکیٹ میں نہ آئے تھے۔

کل ہائیڈ پارک کارنر میں ایک افریقی سے ہم نے بھائی چارہ جتایا تو وہ بولا، تم کس منہ سے خود کو کالا کہتے ہو۔ جاؤ اپنا منہ دھو رکھو۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اقوامِ عالم میں عزّت کی جاء پانے کے لیے اپنے چہرے پر کالک ملیں یا ملوائیں؟ اپنے ہونٹ موٹے اور آنکھیں باریک کرائیں؟ اپنی جلد پر سفیدی کا آرڈر دیں یا ڈبل ریٹ پر خود کو دھوبی سے دھلوائیں۔ اپنی ناک پر پہیّہ پھروائیں یا پھر اپنا منبع و مخزن تلاش کریں اور سرخروئی کے ایسے سامان بہم پہنچائیں کہ سبھی ہمیں پلٹ کر دیکھیں اور ہم پر رشک کریں۔

یارو! بڑائی رنگ اور نسل کی نہیں ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں لندن اور پیرس گمنام قریے تھے، گندگی کے ڈھیر تھے۔ پادری لوگ نہانے والوں کے کوڑے لگوایا کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہو گئے ہیں جمعہ کے جمعہ نہانے لگے ہیں۔ ۱۸۶۸ء سے پہلے جاپان کا شمار دنیا کی قوموں میں کہیں بھی نہ تھا۔ چینی ابھی کل تک آدھے افیمچی اور آدھے ڈاکٹر نومانچو تھے۔ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ تھا کہ یونان کے جھنڈے ہر طرف گڑے تھے پھر رومنوں نے بادشاہی کی۔ عرب کیا تھا بس اک جزیرہ نما تھا۔ لیکن یہاں سے روشنی کی ایک مشعل چلی اور قرطبہ، بغداد، دمشق اور قسطنطنیہ کے مناروں سے دنیا بھر میں علم و تہذیب کا نور تقسیم ہوا۔ سو سب ملّتیں اور رنگتیں یا زبانیں اور

سرزمینیں اپنی ہمّت اور اپنے اعمال سے سرفراز ہوتی ہیں۔ یہاں کسی کا کُوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ کسی فرقے یا فرد کی خلافت موروثی نہیں۔ ہم میں کیا نہیں ہے۔ ارضِ ہند کا نمک ہے۔ عرب کی صلابت ہے۔ ایران کی موزونیت ہے۔ لیکن اے خامۂ بے لگام اور طبع خود پسند! بس بس، اپنے دہی کو کون کھٹّا کہتا ہے۔ برطانیہ کے لوگ آج کل ایک سرکاری رپورٹ سے یہ معلوم کرکے بِلبِلا اُٹھے ہیں کہ ہر سال چھ ہزار دو سو سائنسدان، انجنیئر اور تربیت یافتہ کاریگر انگلستان سے دوسرے ملکوں خاص کر امریکہ کی راہ لیتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو تین گنا زیادہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ ایک انجنیئر سائنسدان یا کاریگر کی تربیت پر برطانیہ کا چھ ہزار پاؤنڈ سے سولہ ہزار پاؤنڈ تک صرف ہوتا ہے امریکہ میں کسی کو تربیت دیں تو انہتّر ہزار پاؤنڈ خرچ کریں۔

یہ چیز جسے برین ڈرین یعنی تربیت یافتہ لوگوں کی ملک سے ہجرت کہا جاتا ہے، برطانیہ کے لیے اگر خطرہ ہے تو ہم ایسے ملک کے لیے جو ترقّی یافتہ نہیں بلکہ ترقّی کی راہ پر ہے، مہاخطرہ ہے۔ پرسوں ایک پاکستانی بزرگ لندن سے گزرے، وہ ترکِ وطن کر کے مستقلاً کینیڈا جا رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ کہتے تھے کہ پاکستان میں کیا دھرا ہے۔ کینیڈا میں موٹی تنخواہ ملے گی۔ اگر ملک پسماندہ ہے تو کیا ہم بھی پسماندہ رہیں؟

اگلی نسلوں کے فائدے کے لیے اپنا آرام اور اپنی امارت کے امکانات تیاگ دیں؟
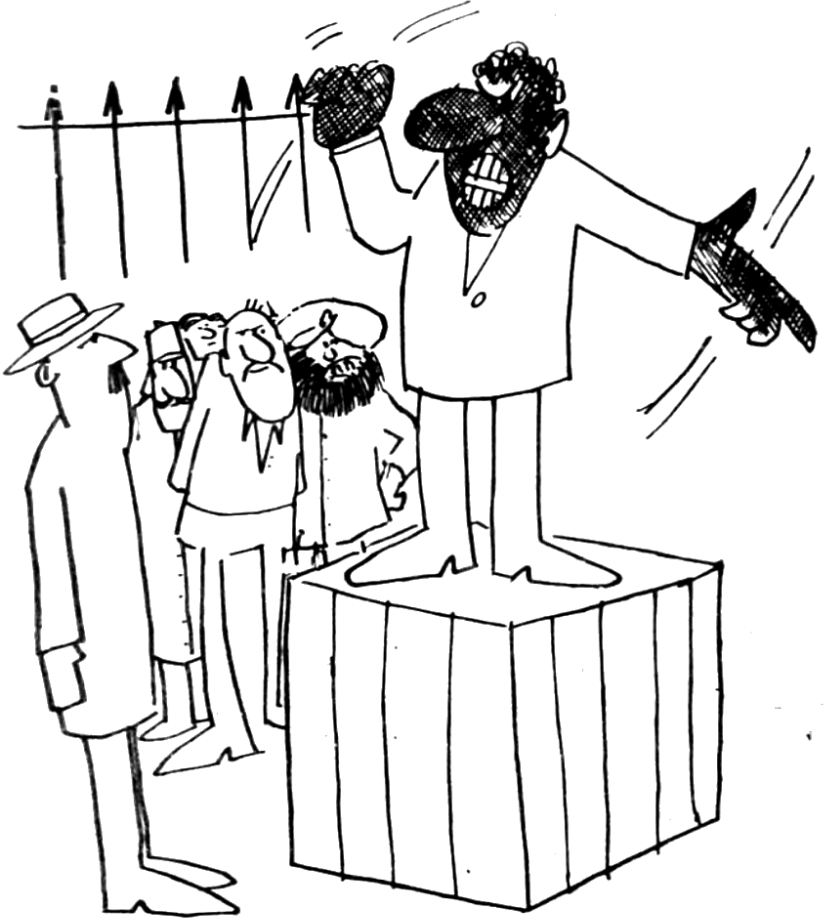
ایک اور صاحب ہیں، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں کوئی پندرہ سال سے یہاں پڑے ہیں ہم نے ان سے کہا یہاں کیا لذّت ہے؟ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو پاکستان میں بھی عیش کرتے ہیں۔ یہاں گھر کے برتن تک دھوتے ہو۔ آج کل بیمار ہو کر اسپتال میں ہیں معلوم ہوا کہ کوئی دیکھنے نہیں جاتا۔ ان ترقّی یافتہ ملکوں میں سارے رشتے اقتصادی ہیں۔ بیوی بھی چند روز میں تنگ آ جاتی ہے۔ ہم ایسا حال نہیں کہ بیمار دوست بھی عیادت کو بھاگے جا رہے ہیں۔ کسمپرسی کے عالم میں ان پر رِقّت طاری ہوئی تو ہم نے کہا: میاں نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ وطن میں آمدنی چاہے اتنی نہ ہو لیکن اس میں اس سے زیادہ عزّت اور آرام سے گزرے گی اور پھر اگر تم نے کچھ پڑھا لکھا ہے تو اس سرزمین کو بھی تو فائدہ پہنچاؤ جس نے تمہیں جنم دیا۔ آہ بھر کر رہ گئے۔ انگریز بیوی کر رکھی ہے اسے پاکستان کا گرد و غبار پسند نہیں۔

یہی بات ہم نے ایک ڈاکٹر سے کہی۔ بڑے ذہین آدمی ہیں۔ لندن سے باہر ایک شہر میں رہتے ہیں۔ ایم بی بی ایس لاہور سے کیا تھا۔ کہنے لگے ہاں لاہور، لاہور ہے۔ یاد آتا ہے۔ اُردُو کی کتابیں رسالے بھی دیکھے ہوئے مدّت ہوئی۔ اب تم نے دِکھائے تو وطن کی سوندھی خوشبو آئی لیکن ہم نے یہ مانا رہیں دِلّی میں پر کھائیں گے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان میں ڈاکٹروں کے گریڈ بتانے شروع کیے پاکستان میں اپنی

ملازمت کے تجربے سُنائے۔ ان کو ہم شافی جواب نہ دے سکے کیونکہ کچھ قصور ہمارا بھی نکلا لیکن ان ڈاکٹر صاحب کے نفع نقصان کو چھوڑ کر سوچا جائے تو کتنے لوگ ہمارے ملک کے قصبوں اور دیہات میں محض ڈاکٹر نہ ہونے سے اور طبّی امداد نہ ملنے سے مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کینیڈا چلے جائیں تو فقیر کی چٹکی سے علاج کرنے والوں، طبِ چین و جاپان کے اشتہار دینے والوں اور مقناطیسی انگوٹھیوں اور کنگنوں والوں، عاملوں کاملوں، تعویذ گنڈے کرنے والوں اور فٹ پاتھ کے پروفیسروں کی کیوں نہ چاندی ہو۔ ہم نے چین میں ایک ڈاکٹر سے کہا تھا کہ تم یہاں دو سو روپلی ماہوار لے کر کیا کر رہے ہو، کینیڈا چلے جاؤ، دس ہزار روپے ملیں گے۔ مُسکرا کر کہنے لگا کہ میاں روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے اگر میرا ملک کنگال ہے تو میری امیری کس کام کی۔ چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو۔ ہمارے ملک میں جو لوگ مزدوری پیشہ ہیں۔ کوئی ٹیکنیکل مہارت نہیں رکھتے۔ وہ شوق سے دوسرے ملکوں میں جائیں۔ اپنی حالت سدھاریں۔ کمائیں گے تو ان کا کچھ پیسہ زرِ مبادلہ کی صورت میں ملک میں بھی آئے گا۔ لیکن ڈاکٹر انجنیئر سائنسدان تو ہمارے ہاں لاکھوں میں ایک نکلتا ہے۔ وہ بھی ہمارے ہاتھ اور ہمارے ساتھ نہ رہا تو یہ چار سالہ اور پنج سالہ منصوبے آپ کیسے پورے کریں گے۔ پھونک مار کر تو کارخانہ نہیں بنایا جا سکتا نہ امام ضامن باندھ

کر اسے چلایا جا سکتا ہے۔

کچھ لوگوں کو باہر جانے کا یوں شوق ہوتا ہے ہمارے ایک دوست جنہوں نے نہایت اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ یہاں لندن میں کچھ دِن ایک ہوٹل میں بیرے رہے پھر ایک جگہ چوکیداری کی۔ بس کنڈکٹر بھی رہے۔ آخر وطن واپس چلے گئے، پرسوں ایک پاکستانی بیمہ کمپنی کے لندن دفتر کے منیجر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا میں نے تو سارا عملہ پاکستانی رکھا ہے۔ ہم نے کہا، ساتھ لائے ہوں گے آپ۔ جیسے سر سیّد اپنے نوکر کو ساتھ لاتے تھے۔ کہنے لگے جی نہیں۔ ایک مثال سُنیے۔ میں یہاں ایک پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ ایک بیرا مجھے دوسروں سے زیادہ شائستہ معلوم ہوا۔ اس کی انگریزی بھی بامحاورہ تھی۔ میں نے پوچھا۔ پاکستان میں کیا کرتے تھے بولا راج شاہی یونیورسٹی میں لیکچرر تھا۔ موصوف ایم کام کا امتحان پاس کیے ہوئے تھے کسبِ کمال کر کے اب گاہکوں سے ٹِپ لیتے تھے اور اُن کو تھینک یو کہنے پر مجبور تھے۔ میں نے کہا، ہماری بیمہ کمپنی میں نوکری کرو گے؟ بولا ضرور کروں گا۔ بلا تنخواہ بھی کروں گا، مجھے یہ کام سِکھا دیجیے۔ میں نے اسے اگلی صُبح آنے کو کہا اور اب وہ میرے ہاں خاصا کام کر رہا ہے کوئی دِن میں آفیسر گریڈ میں چلا جائے گا۔ اگر یہ بات ایثار کی ہے تو یہ ایثار کہیں سے تو شروع ہونا چاہیے۔ اوپر سے نہیں تو نیچے سے۔

یہ نیچے سے نہیں تو اوپر سے۔ بات پھر چین کی آگئی۔ کتنے ہی چینی انجنیئر اور سائنسدان جو امریکہ اور یورپ میں بیش قرار آمدنی کے مالک تھے۔ اس پر لات مار کر اپنے وطن آگئے وہاں جیسی دوسروں کی اوقات ویسی ان کی۔ بنک بیلنس بیشک نہیں ہیں، نہ لمبی کاروں کی ریل پیل ہے نہ اُونچے محل حویلیاں میں لیکن مزے سے گزر کرتے ہیں۔ تبھی تو ان لوگوں نے ہائیڈروجن بم بنالیا۔ ہم زیادہ سے زیادہ تانگے کا بم بنا سکتے ہیں۔

یہ ملک برطانیہ عظمیٰ۔۔۔ ہمارا پرانا آقا جس کے قدموں تلے کبھی دھرتی دہلتی تھی۔ آج کامن مارکیٹ کی ممبری کے لیے عرضیاں دیتا پھرتا ہے اور فرانس جیسے ملک اسے دھتا بتاتے ہیں۔ لندن کے چہرے کا فروغ اگر قائم ہے تو ٹورسٹوں کے بل پر۔ یہاں کے بڑے بڑے اسٹوروں کے خریدار یہاں کے مقامی لوگ نہیں بلکہ سیر و سفر پر باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ خود ہم نے ایک دکان سے آٹھ دس ٹائیاں خریدی ہیں۔ ایک جگہ سے سوٹ خرید کر برطانیہ کی معیشت کو تھوڑا استحکام بخشا ہے اور اس ملک کی مزید مدد کے لیے کل ایک ساتھ کئی جوڑے جرابوں کے اور ایک جوتا خریدنے کا ارادہ ہے۔ کیا کریں اس ملک سے ہماری پرانی سیاسی اور ثقافتی یاد اللہ ہے۔ مصیبت کے وقت ہم اس کے کام نہ آئیں گے تو اور کون آئے گا؟

بیان لذّتِ آوارگی کا

لندن میں آج کل ہپی لوگوں Hippies نے زور باندھ رکھا ہے۔ یوں تو یہ خدائی خوار کہاں نہیں ہیں لیکن لندن ان کو زیادہ مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پکاڈلی سرکس اور ٹریفالگر اسکوائر ان کے خاص ٹھکانے ہیں۔ اتوار کی شام ہائیڈ پارک پر بھی یورش کرتے ہیں۔ بال اُلجھے، کپڑے چیکٹ، داڑھیاں پریشان، پاؤں رکھتے ہیں کہیں اور کہیں پڑتا ہے۔ زیادہ تر جوڑے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، گلوں میں گھنٹیاں، ہاتھوں میں پھول، گل ہائے محبّت، مانگتے ہوئے، کھاتے ہوئے جہاں جی چاہا پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے یا لیٹ گئے۔ بجھے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے اُٹھا کر پینے لگے۔ کسی نے پھُول دار چھینٹ کا فرغل پہن رکھا ہے۔ کسی نے روئی کی بنڈی، گلے میں مالا بھی ہے اور آنکھوں میں مستی بھی شراب کی سی نہیں، چانڈو کی سی۔ بہت سے عذر مستی بھی رکھتے ہوں گے۔ توجہ طلبی کے لیے بھیس بنا رکھا ہوگا۔ لیکن زیادہ تر کی وارستگی اصلی

معلوم ہوتی ہے۔ آپ اسے ذہنی روگ کہہ لیجیے۔ لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اُن کی طرف کھینچتی بھی ہیں۔ بعضے ان پر نفرین کرتے ہیں۔ بعضے ہمدردی جتاتے ہیں۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ بعضوں کے نزدیک یہ اس معاشرے کا ردِّ عمل ہے جو اس درجہ سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا کہ باپ گھر کے اندر بھی شام کو کھانے پر بیٹھتا تھا تو باقاعدہ ڈنر جیکٹ زیب تن کر کے۔ عہدِ وکٹوریا کی اخلاق پرستی مشہور ہے۔ ہم نے اس صدی کے آغاز کے لباس میوزیم میں دیکھے۔ عورتیں یہ لمبے لمبے لہنگے پہنتی تھیں۔ گلے کے اوپر تک بٹن بند رہتے تھے اور پیراہن بھی خوب جھالر دار ہوتے تھے۔ سو وہ لباس قطع و برید کے بعد منی اسکرٹ تک پہنچا۔ یہی قطع و برید معیارِ اخلاق میں بھی ہوئی۔ پہلے زمانے میں سر بازار چوما چاٹی کا ایسا دستور نہ تھا جیسا آج ہے۔ وہی لندن ہے جس میں آج ہپی لڑکے لڑکیاں اپنے کالروں پر یہ بیج لگائے پھر رہے ہیں۔

لینا کہ چلی میں۔۔۔۔ (I am Feeling Sexy)

میں کنواری ہوں۔ یعنی آ بیل مجھے مار (I am virgin)

اٹھالے جو بڑھا کر ہاتھ (I am for freedom of sex)

میں نشے میں ہوں (I am an LSD Addict)

میں نفسیات کا ماہر ہوں، سیدھی لیٹ جاؤ(I am a psychiatrist, Lie down)

یہ بیج ڈیڑھ شلنگ میں ہر جگہ بکتے ہیں۔ پکاڈلی میں، ٹریفالگر اسکوائر میں، ماربل آرچ پر، ٹاٹنہیم کورٹ روڈ پر۔ گندے رہنا ان خانہ خرابوں کا شیوہ ہے بعضے ننگے پاؤں

رہتے ہیں۔ آنکھیں میلی، دانت میلے اور سر تو جھاڑ بنا ہوا۔ مردوں کی داڑھیاں ایک سے ایک نرالی دھج کی۔ داڑھی اب ولایت میں آوارگی کے سامان میں شامل ہے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں ”میاں داڑھی والے ہو کر یہ حرکتیں کرتے ہو“ یہاں یہ کہا جاتا ہے۔ ”داڑھی منڈے ہو کر یہ آوارہ پن؟ شرم تو نہیں آتی؟“

جو لوگ ذرا پرانے خیال کے ہیں۔ دانتوں میں انگلیاں دابے کہتے سُنائی دیتے ہیں کہ یہ کیسا زمانہ آن لگا ہے۔ کیوں ان چھوکریوں کے دیدے پٹم ہو رہے ہیں۔ ڈیلی ٹیلی گراف میں ڈگلس کلیورڈن نے ایک مضمون لکھا ہے۔ ”دوشیزگی کی حمایت میں“ اس کا کہنا ہے کہ جنسی جذبات کا اُبال تو ہمیشہ ہر زمانے میں عورت مرد میں اُٹھتا رہا ہے۔ لیکن اگلے زمانے میں بے راہ روی کے مواقع کم تھے۔ اب تو خود کمانے والی لڑکیاں آزاد ہیں۔ ان پہ کوئی چاہے بھی تو کیسے پہرہ رکھ سکتا ہے ہر آفت سے بچانے کے لیے گولی ہے۔ تحریص کے لیے موٹر سائیکل ہے۔ اسپورٹس کار ہے۔ بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر سے بلکہ ملک سے باہر جا کر چھٹی منانے کی آزادی ہے۔

گر ہو شراب و ساغر و محبوب خوبرو

زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

اِدھر نوجوانوں کے لیے بے شمار مواقع ہیں کسی بھی دوشیزہ کو اپنی راہ پر لانے کے۔ بس ذرا تیکھی مونچھیں ہوں۔ روپے پیسے کی بھی شرط نہیں۔ کیونکہ لڑکی خود کماتی ہے۔ اُدھر لڑکی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی ہے کہ اگر کوئی پیار کرنے کے لیے اس کا طالب نہیں ہوتا تو وہ نکو بنتی ہے۔ خود کو ہم چشموں کی نظر میں حقیر محسوس کرتی ہے۔ جہاں سات سہیلیاں ملتی ہیں اور اپنے معاشقے بیان کرتی ہوں وہاں اس کا احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا قدرتی بات ہے۔

کلیورڈن صاحب نہ وعظ کرتے ہیں نہ قربِ قیامت کی نوید دیتے ہیں۔ ان کی دہائی یہ ہے کہ یارو کچھ لڑکیاں تو ایسی ہوں گی جو اپنی عصمت بچانا چاہتی ہوں گی اور شریفانہ شرطوں یعنی شادی کا انتظار کرنا چاہتی ہوں گی۔ پرانے زمانے میں ایسی لڑکیوں کو اس خیال سے تقویت رہتی تھی کہ معاشرے کا اخلاقی ضابطہ ان کی پشت پر ہے۔ ان کو بنظرِ تحسین دیکھتا ہے۔ آج ایسی کوئی روک نہیں۔ معاشرہ انہیں سراہے گا تو کیا عجیب نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔

یہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا، اس زمانے میں

Are we the last married generation?

سنڈے آبزرور نے بھی ایک لمبا چوڑا مضمون چھاپا ہے۔ ”کیا شادی کا رواج ہماری نسل کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟ یعنی آئندہ لوگ رہا کریں گے میاں بیوی کی طرح لیکن شادی کی کھکھیڑیں اٹھائے بغیر۔“ آبزرور نے آنے والے دور کی دُھندلی سی یہ تصویر دکھاتے ہوئے اس کی وجہ بیان کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کی جاتی تھی معاشرتی اور اقتصادی تحفظ کے لیے۔ عورت شادی نہ کرتی تو کھاتی کہاں سے؟ شادی کے تصوّر کو کچھ تقویت مذہب سے ملتی تھی اور کچھ رومانی ناولوں سے۔ اب لوگوں کی عمریں لمبی ہو گئی ہیں۔ ایک ساتھی کے ساتھ اتنی بڑی جنسی زندگی گزارنا دشوار ہے۔ لڑکے لڑکیاں اب بلوغت کو بھی جلد تر پہنچتی ہیں اور شادی سے پہلے جنسی تجربہ اب ایک قدرتی اور مُسِنہ بات گنی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو شادی کے بعد مکمل جنسی وفاداری کی نہ توقع کرتے ہیں نہ اسے اہم جانتے ہیں۔ اب شادی عورت کا معاشی سہارا بھی نہیں۔ وہ خود جو کماؤ ہے۔ نئے واعظینِ اخلاق (الیکس کمفرٹ وغیرہ) کا کہنا ہے کہ ایک مرد یا عورت اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے سے بھی مخلصانہ محبّت کر سکتا ہے یا کر سکتی ہے۔ اس میں بے وفائی کی کوئی بات نہیں۔ دونوں سے وفا ممکن ہے۔ ظاہر ہے ان

واعظین کے تصوّرِ عشق میں جنسی واردات بھی شامل ہیں۔

اس سلسلے میں آبزرور کے مضمون نگار نے بہت سے جوڑوں سے انٹرویو بھی لیے۔ ان میں ایک صاحبہ ویلری ہاورتھ بھی ہیں۔ عمران کی چوبیس برس ہے اور ایک بچّہ ہے پانچ سال کا۔ ایک دفتر میں سیکرٹری ہیں۔ شادی ان کی اب تک نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ۱۹ برس کی تھی، جب اسٹیوارٹ پیدا ہوا۔ میں نے گھر سے بھاگ کر نوکری کرلی، اور اب ایک لڑکی کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میں نے اسٹیوارٹ کے باپ سے شادی کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ وہ اچھا شوہر بھی نہ ثابت ہوتا۔ کبھی بچّہ پوچھتا ہے کہ ”امی میرا باپ کوئی کیوں نہیں؟“ میں جواب دیتی ہوں اس لیے کہ ”امی نے شادی ہی نہیں کی۔“ وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ میرے بوائے فرینڈز سے وہ خوب گھلا ملا رہتا ہے۔ ایک روز بس میں ایک عورت نے کہا۔ ”کتنا پیارا بچّہ ہے۔ بیٹے تمہارے ابو تو تم پر بڑا ناز کرتے ہوں گے۔“ اسٹیوارٹ نے جھٹ کہا۔ ”میری امی کی شادی ہی کہاں ہوئی ہے۔“ وہ بے چاری صدمے سے بے ہوش ہوتے بچی۔ مس ہاورتھ کہتی ہیں کہ میں اپنی زندگی سے ناخوش نہیں۔ میرے مرد دوستوں کی طرف سے دوبارہ مُجھے شادی کی پیش کش بھی ہو چکی ہے۔ میری دو سہیلیاں جو جلدی میں شادی کر بیٹھیں میری زندگی پر رشک کرتی ہیں۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔۔۔

مغرب میں تو محبّت اور شادی دونوں کا بولو رام ہو اجاتا ہے۔ امریکن پرچے اسکوائر میں درجنوں ایسے یونیورسٹی کے طالب علم جوڑوں کی تصویریں چھپی ہیں جو بن بیاہے میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ اب ادب میں بھی گالز وردی کے سیب کے درخت کی ہیروئنیں نہ ملیں گے۔ وفا میں گھُل گھُل کے مرنا جینا دونوں متروک ہوئے۔ "ترے کوچے ہر بہانے ہمیں دِن سے رات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا" مغرب والوں کے نزدیک یہ شعر بے معنی ہے۔ آج کے شاعر کا چاند بالائے نام نہیں ہے اس کے پہلو میں ہے نہ عہد و پیماں نہ شکوے شکایت۔۔

نے بے مہری جاناں نہ سیاست درباں

ہپی لوگ ذرا زیادہ انتہا پسندانہ مظاہرہ سہی لیکن سارے آوے کا یہی حال ہے۔

ہپی یورپ میں تو اب ایجاد ہوئے ہمارے ہاں صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ ہم ناحق ان کا تماشا کرنے اتنی دور آئے، پکاڈلی سرکس میں اپنی شامیں خراب کیں۔ یہ پریشاں گیسوؤں، لمبے چغوں، جھالر دار داڑھیوں، میلے کرتوں اور لمبی مالاؤں

منکوں، کشکولوں، گھنٹیوں، ناقوسوں، تعویذوں والے ہمارے ہاں کیا کم ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ کس چیز کی کمی ہے۔ مولا مری گلی میں بھنگ گھٹتی ہے، چانڈو کا دم لگتا ہے، کونڈی سونٹے کے گھنگرو بجتے ہیں، سبزی کے جام تقسیم ہوتے ہیں۔ ہو حق، ہو حق، لگے دم مٹے غم۔ شاعر نے ان مچھندروں کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

پھرتے ہیں یوں شہر کے اندر

آگے کتّے، پیچھے بندر

دم مولا دم مست قلندر

ان میں بعضے بے اولادوں کو اولاد بخشتے ہیں۔ عذرِ مستی رکھ کر ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں۔ پھونکیں مار کر مقدمے جتاتے ہیں، بعضے تو ہنڈیا میں ڈال کر روپے بھی دُگنے کر دیتے ہیں۔ سرکاری ٹکسال یا اسٹیٹ بنک جانے کی حاجت ہی نہیں۔

ہر دور اور ہر زمانے کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ جب تک انسان پتھّر پر پتھّر مار کر آگ جلاتا تھا اور سموچے ہرن یا بیل کو آگ پر بھونتا تھا، یہ ایٹم بم، کمپیوٹر اور غیر ملکی زر

مبادلہ کے ٹنٹے نہیں تھے۔ تب تک ہر جگہ امن اور شانتی تھی، لوگ مراقبوں میں جاتے، تپسیا کرتے اور اپنی ذات کو رفعت بخش کر بڑے اطمینان سے اپنی اپنی قبر میں چلے جاتے۔ پھر بقول استاد ذوق: خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے یعنی آبادی بڑھی، حرص بڑھی۔ جوع الارض بڑھی۔ لوگوں نے علم سے کارِ ابلیسی لینا شروع کیا اور بات تیر و تبر سے ہوتے ہوئے ہائیڈروجن بم اور میزائلوں تک پہنچی۔ تپسیا اور اعتکاف کے زمانے گئے۔ اب کسی آدمی کی ذاتی نیکی اور تقشّف بے معنی چیزیں ہیں۔

"موج ہے دریامیں اور بیرون دریاکچھ نہیں"

ایک یورپین ایک روز ہماری روحانیت کی تعریف کر رہا تھا۔ ہم نے کہا، اے بھیّا ہمارے ساتھ سوداطے کرلے۔ یہ روحانیت تو لے لے، ہم تجھے اپنے صوفی بھی بخشتے ہیں۔ تصوّف کی دولت بھی تیری نذر ہے۔ ہمارے ہاں شاعر بھی بڑابڑا پڑا ہے۔ وہ بھی سپردم بتومایہ خویش را۔ یہ سب لے کے تو اپنی روح کی پاکیزگی کا اہتمام کر۔ اتنے میں ہم تیرے ٹریکٹر، تیری مِلیں، تیری حرفتیں، تیرے ٹیکنیکل کالج اور تیرا زرِ مبادلہ استعمال کرتے ہیں۔

ہمارا نسخہ مشرق و مغرب کی حتّیٰ الوسع ہم سطح کرنے کے لیے یہی ہے کہ ہم اپنا تصوّف مع قوّالوں کے اور اپنی شاعری مع اس کے سوز و گداز کے ایکسپورٹ کریں اور سائنس اور ٹیکنالوجی درآمد کریں۔ کُچھ ان لوگوں کی رفتار سست ہو کچھ ہماری تیز ہو۔ جب برابر آ جائیں گے تو سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ حضرت حفیظ جالندھری نے فرمایا ہے۔

ہاں ملے غیر کو بھی درد کی دولت یارب

ایک میرا ہی بھلا ہو، مجھے منظور نہیں

لغاتِ عاشقاں سے گھمکول شریف تک

جانے لوگ ان گلیوں کوچوں کے نام گارڈن بلکہ گارڈنز کیوں رکھتے ہیں۔ جہاں ایک پتّی سبزے کی نہیں ہوتی۔ کوئینز گارڈن کے سامنے تو خیر باغیچہ ہے۔ خاصا بڑا ہے، ہمارے گھر کے لان سے بھی بڑا، لیکن پورچسٹر گارڈن وغیرہ نام تو لوگوں کو سبز باغ دکھانے کو رکھے گئے ہیں۔ ایک اور بات یہ کہ ہمارے ہاں پارک چھوٹی سی چیز ہوتی ہے، جیسے اورنگ زیب پارک، ہاسا سنگھ پارک، وغیرہ۔ لیکن گارڈن بڑا ہوتا ہے۔ برنس گارڈن، لارنس گارڈن وغیرہ۔ یہاں اس کے اُلٹ ہے۔ یہاں پارک بڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈ پارک، ریجنٹ پارک وغیرہ۔ جانے کیوں یہ اُلٹی گنگا بہائی گئی ہے۔ پھر یہاں کے پتے پریشان کرتے ہیں۔ ایک نام لے لیجیے، مثلاً لینسٹر، ایک تو لینسٹر روڈ ہوگی۔ پھر اس میں لینسٹر گارڈن ہو گا، لینسٹر اسٹریٹ ہو گی۔ لینسٹر پیلس ہو گا۔ لینسٹر اسکوائر ہو گا۔ لینسٹر یارڈ، لینسٹر وے، لینسٹر گروو، لینسٹر میوز بھی وہی

جو پرانے زمانے کے اصطبلوں کی کٹڑیاں بنالی گئی ہیں اور اس پر اِکتفا نہیں اس میں کوئی بھلا مانس اپنے مکان کا نام لینسٹر بلڈ نگز رکھ لے گا۔ لینسٹر کیفے، لینسٹر لاج، لینسٹر ہاؤس وغیرہ۔ ہمیں ایک جگہ واروک گارڈنز کا پتہ دیا گیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف واروک ہی واروک ہے کوئی ایونیو ہے تو کوئی یارڈ ہے کوئی اسکوائر ہے تو کوئی گارڈن ہے۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ قیامت یہ ہوئی کہ واروک گارڈنز دو ہیں۔ ایک لندن W2 میں یعنی ہمارے قریب، ایک لندن W14 میں خاصی دور۔ آخر تھک ہار کر ہم واپس آ گئے۔ پیرس میں بھی ایونیو بولوار۔۔۔ پلیس وغیرہ کے چکّر بہت ہیں اور ہمارے ہاں بھی روڈ، اسٹریٹ، بازار کوچہ، گلی وغیرہ کا سلسلہ ہے لیکن انگریزوں کا مقابلہ نہیں۔ خدا جانے یہ لوگ اپنے گھر کیسے تلاش کرتے ہیں۔

(۲)

واٹرلو اسٹیشن کے بک اسٹال پر ایک کتاب بک رہی ہے۔

”لغات عاشقاں(The Love Dictionary)“

بعد میں یہی کتاب لندن کے مشہور اور ایک دعوے کے مطابق دِیا کے سب سے

بڑے کتب فروش فوائل کے ہاں بھی پائی۔ یہ ایک ہدایت نامہ ہے۔ ورغلاہٹ Seduction کے لیے سرورق پر جابجا ہونٹوں کے بوسوں کے گلابی نقوش ہیں اور اندر گفتگو کی صورت میں ٹوٹکے دیے گئے ہیں، پانچ مختلف زبانوں میں اس کتاب کی مدد سے انگریزی، فرنچ، جرمن، اٹالین اور ہسپانوی زبان میں کسی اجنبی لڑکی سے اظہارِ عشق کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب حسبِ مراد ملتا ہے یا چپّل سے مرمت ہوتی ہے۔ اس کی ذمّہ داری مصنّف قبول نہیں کرتا۔ نمونہ کلام:

جہاز میں سفر کرتے ہوئے:

"ارے میں کہاں آگیا مجھے سوتے میں چلنے کا مرض ہے۔"

"میرے کیبن سے سمندر کا نظّارہ زیادہ اچھا ہو سکتا ہے۔"

ہوائی جہاز میں:

"میں ذرا آپ کا ہاتھ پکڑ لوں جب جہاز اُڑتا ہے۔ تو میں گھبرا جاتا ہوں۔"

"یہ سیٹوں کے درمیان کا ہتھا نکال لیں تو زیادہ آرام رہے گا۔"

گاڑی میں:

"بتی بجھادوں؟ میری آنکھوں کو روشنی سے تکلیف ہوتی ہے۔"

"معاف کیجیے۔ یہ پانچ پاؤنڈ کا نوٹ آپ کا معلوم ہوتا ہے"

ساحل پر:

"ارے میں سمجھا آپ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ اس لیے مصنوعی تنفّس دے رہا تھا"

"میں آپ کے تیراکی کے سوٹ میں سے ریت نکال دوں؟"

"میں تولیہ پکڑ کر آڑ کرتا ہوں آپ کپڑے بدل لیں۔۔۔"

سینما میں:

"سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ وہاں سے اچھا نظر آتا ہے۔"

"اوہ میں سمجھا یہ میری کرسی کا ہتّھا ہے۔"

"میرا دستانہ آپ کی ٹانگوں کے آس پاس گر گیا تھا۔"

اپنے فلیٹ میں:

"میں بتانا بھول گیا تھا کہ میرے والدین یکایک گاؤں چلے گئے ہیں"

"پتہ نہیں بلب کا فیوز کیسے اڑ گیا۔"

"یہ کمرے کا تالا کیوں جام ہو گیا"

اُس کے فلیٹ میں:

"تھک گیا ہوں ذرا لیٹ جاؤں۔ آپ بھی یہاں آرام کر لیجیے"

(اس کا میاں آ جائے تو)

میں بجلی والا ہوں۔ میٹر دیکھنے آیا تھا۔"

ہوٹل میں:

(لفظ کوئی بھی فحش نہیں لیکن کوئی فقرہ نقل نہیں کیا جا سکتا)

اس کی والدہ سے:

”میں نہیں مانتا آپ اس کی والدہ ہیں۔ اس کی بہن ہوں گی آپ۔۔۔“

(پیچھا چھڑانا ہو تو)

”معاف کیجیے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری بیوی اس پر رضامند نہ ہو گی۔“

کچھ مفید مطلب کلمات:

تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تنہائی میں اپنے پر اعتبار نہیں کر سکتا۔۔۔ اے میری زندگی کی روشنی۔“

”اے ملکوتی چہرے والی۔۔۔“

”تمہارا حسن پاگل کر دینے والا ہے۔“

”تم دوسری عورتوں سے الگ ہو“

”رسموں کے جھگڑے میں نہیں پڑا کرتے۔“

(۳)

ساؤتھ کنسنگٹن میں پرانی کتابوں کی ایک دکان پر ایک صدی پہلے کا ایک پرچہ نظر آیا۔

Teasing Made Easy (ادا کیسے دکھائی جائے)

عورتوں کے لیے نصیحت نامہ:

تصویروں (کارٹونوں) کے نیچے عبارت ہے:

"عورت کو چاہیے کہ ایک دِن بے حد اشتیاق ظاہر کرے۔ دوسرے دِن چہرے پر تیوری چڑھا لے اور اپنے کو دور کھینچے۔ بے رُخی سے جواب دے لیکن اس بیچ میں ایک نظر محبّت بھری بھی ڈالے۔ رُخصت کے وقت کہے خدا حافظ اے ظالم۔۔۔ اگلی صُبح وہ ضرور آئے گا۔ اس وقت ٹسوے بہائے اس کی بانہوں میں خود کو ڈال دے۔ وہ خود اپنے ناکردہ گناہ پر نادم ہو گا اور معافی چاہے گا۔ اس وقت معافی دے دینی چاہیے۔۔۔وغیرہ"

(۴)

انگریزی اخبار کے اشتہارات کے کالم میں سے:

"سینکڑوں برطانوی اور غیر ملکی لڑکیاں دوستوں کی متلاشی ہیں۔ پتہ ذیل پر خط لکھیے"

گلوبل۔ ۵۲ ارلز کورٹ روڈ۔ لندن

"رومانس لڑائیے یا شادی کیجیے۔ لڑکیوں سے ملانا ہمارا ذمّہ۔ ہر عُمر کی ہیں اور خوبصورت۔

پتہ: الفاء ۳۰ بیکو اسٹریٹ۔ لندن

ہمارے کلب کی خواتین ارکان کے لیے مردوں کی ضرورت ہے۔

پتہ: ۴۷ امہرسٹ پارک۔ لندن

"آپ اُمّید سے تو نہیں ہو گئیں؟ ہم سے معائنہ کرائیے۔ فیس دو پاؤنڈ۔ معاملت صیغۂ راز میں رہے گی۔"

پتہ: بیل جنکنز ۴ چارلٹ روڈ لندن

۲۵ سال کے ایک نوجوان کو عورت چاہیے۔ ۲۵ سے ۴۴ سال تک کی۔ کنواری ہو، بیوہ ہو، طلاق یافتہ ہو۔ کچھ پروا نہیں۔ مقصود دوستی ہے:

بکس نمبر ۳۵۱

برطانوی کنوارا عمر چالیس سال۔ کسی ہندوستانی، ایشیائی، ایفروایشیائی لڑکی سے دوستی چاہتا ہے۔ عمر ۳۵ تا ۴۵ سال قابلِ قبول ہے۔

ایک خانقاہ کا تربیت یافتہ پادری عمر ۲۹ سال۔ اعلیٰ ڈگری یافتہ۔ شرمیلا۔ ایسی عورت

سے جھٹ پٹ یارانہ چاہتا ہے جو راز کو راز رکھے۔

اور دوسرے سِرے پر:

لندن کے ایک اردو اخبار میں اطلاع عام:

کاونٹری (انگلستان) گھمکول شریف کوہاٹ کی خانقاہ نقشبندی کے سالانہ عرس کے موقع پر ۸ اکتوبر کو صُبح دس بجے جامع مسجد کاونٹری واقع ایگل اسٹریٹ میں ایک روحانی تقریب منائی جائے گی۔ جس میں نعت خواں اور علمائے کرام شرکت کریں گے۔

سجادہ نشین آف موہڑہ شریف بھی عوام سے خطاب کریں گے۔ علاقہ کے مسلمانوں سے شرکت کی درخواست ہے۔

ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

ہمارے دوست سیّد سبط حسن آج کل لندن میں ہیں۔ بابل نینوا اور بعلبک وغیرہ کے خرابوں کی خاک چھانتے یہاں پہنچے ہیں معلوم ہوا کہ ٹیلی وژن کے اشتہاری پروگراموں کی تکنیک کا مطالعہ کر رہے ہیں ہم سے ملاقات ہوئی تو ہم نے پوچھا کہیے کیسی گزرتی ہے۔ بولے، بشیرا یاد آرہا ہے، ہم نے کہا۔ یہ کون بزرگ ہیں؟ بولے، ارے بھائی اپنا بشیرا جو ہمارا حقّہ بھرتا ہے، ہمارا بستر لگاتا ہے، ہمارا جوتا پالش کرتا ہے، علی الصُبح چائے بنا کر دیتا ہے، ہمارے مہمانوں کے لیے پان سگریٹ لاتا ہے، دھوبی کے ہاں کپڑے دے کر آتا ہے، اور پھر لاتا ہے، گھر کے لیے سبزی گوشت آٹا دال سبھی کا ذمّہ دار ہے۔ ہمارے گھر میں اصل چیز تو وہی ہے، ہم تو مدِّ فاضل ہیں۔ ہمارے بغیر ہمارے گھر کا گذارا بخوبی چل سکتا ہے۔ بشیرا کے بغیر نہیں!

تب معلوم ہوا کہ اپنے ایک دوست کے ہاں مقیم ہیں اور اخلاقاً ہر روز صُبح کو پورے

گھر کے برتن دھوتے مانجھتے ہیں۔ یہ اُن کا خاندانی پیشہ کبھی نہیں رہا۔ لہٰذا ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں ان پر تیل لگاتے ہیں اور ہاتھ سینکتے ہیں۔ چونکہ ان کے دوست اسپتال چلے گئے ہیں لہٰذا انہوں نے فرمایا تمہارے پاس جگہ ہو تو ہم بھی آجائیں۔ ہم نے کہا بسم اللہ۔ سیّد سبط حسن کے ہمارے مکان میں آجانے سے پہلے ہمیں دھوبی نائی کی بڑی دقّت تھی، اب نہیں رہی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے کام کے آدمی ہیں۔ ہم نے اپنے رومال اور ایک دو بنیان دھونے کو نکالے تو بولے، ''کیوں اتنی زحمت کرتے ہو، میرے تھیلے میں ڈال دو، میں تھوڑی دیر میں گھاٹ پر جانے والا ہوں'' ہم نے کہا۔۔ ''گھاٹ؟ آپ جا کر یہ کپڑے دھوئیں گے؟ چھوا چھو کریں گے؟ انہوں نے کہا اس سے آپ کو کیا مطلب۔ آپ اپنے کپڑے اس تھیلے میں رکھیئے اور میں یہ لادی لیے جاتا ہوں۔ دوپہر تک آپ کو دُھلے دُھلائے کپڑے مل جائیں گے۔''

تب معلوم ہوا کہ وہ پڑوس میں ایک لانڈریٹ دیکھ آئے ہیں، یہ ایک دوکان ہوتی ہے جس میں کپڑے دھونے کی مشینیں قطار در قطار رکھی ہوتی ہیں آپ خود ہی مشین میں کپڑے ڈالیے۔ صابن ڈالیے اور ایک سوراخ میں سکے ڈالیے مشین ایک ہینڈل گھمانے سے چلنے لگے گی۔ وہاں سے نکال کے دوسری مشین میں رکھیئے اور

ایک اکنی ڈالیے۔ وہ ان کو پوری طرح نچوڑ دے گی۔ تیسری میں ڈالیے تو چھ پنس میں سکھا دے گی۔ افسوس ابھی تک ایسی مشینیں نہیں نکلیں کہ چھ پنس کا سِکّہ لے کر کپڑے استری بھی کر دیں۔ لیکن اس کے لیے سیّد صاحب ایک جیبی استری لے آئے ہیں جب ذرا گر دن جھکائی کپڑا استری کر لیا۔

کچھ دِن سے ہمارے بال بڑھ رہے تھے سیّد صاحب نے کہا، تم نہ ہپّی ہو، نہ انٹلکچوئل ہو۔ کہو تمہارے بال کاٹ دوں؟، لاہور میں شاکر علی ہمارے بال کاٹ دیا کرتے تھے۔، ہم اُن کے۔۔۔ ہم نے کہا شاکر علی صاحب کی اور بات ہے۔ ان کے سر پر بال ہی کتنے ہیں۔ مُجھے معاف رکھیے کسی نائی کا پتہ بتا دیجیے۔ تب انہوں نے ہماری رہنمائی کی پیش کش کی۔ ایک نائی کے ہاں لے گئے ہمیں اس کی کرسی پر بٹھایا اور خود اخبار پڑھنے لگے۔ لیکن ابھی سُرخی آدھی ہی پڑھی ہو گی کہ نائی نے کہا "بس جناب ہو گئی حجامت، اب لایئے چھ شلنگ دیجیے۔ ہاں صاحب! اب کس کی باری ہے؟ آیئے۔"

ہماری حجامت ہونے میں محاورے کے لحاظ سے بھی اور ویسے بھی، دو منٹ سے زیادہ نہ لگے ہوں گے۔ اس بندۂ خدا نے ایک کنگھا اُٹھایا اور ایک بجلی کی مشین۔ شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا، پھر کچھ معلوم نہ ہوا، یہ بات ہمیں کچھ پسند نہ آئی

کیونکہ آٹھ شلنگ جمع دو شلنگ بخشیش سے قطع نظر جو ہمیں طوعاً و کرہاً دینی پڑی اور جسے لے کر اس شخص نے سلام تک نہ کیا، ہمیں یہ سب کچھ حجام کی دوکان کی روایت کے خلاف لگا۔ ہم نے الف لیلہ میں بوبک حجام اور اس کے بھائیوں کے قصّے پڑھ رکھے ہیں۔ ان کی نسل تو اب ناپید ہوئی تاہم کراچی میں جن خلیفہ کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں وہ بھی کم از کم ہم سے عرب اسرائیل کے مسئلے، آٹے دال کے بھاؤ، نئ نسل کی بے راہ روی اور مذہب سے دوری اور روس اور امریکہ کے گٹھ جوڑ پر ضرور گفتگو کرتے ہیں۔ پیچھے کے بال مشین سے اور آگے کے قینچی سے کاٹتے ہیں۔ اُسترے سے قلمیں بناتے ہیں۔ پھر آگے پیچھے سے شیشہ دکھاتے ہیں، بالوں کی چمپی کرتے ہیں۔ کنگھا کرتے ہیں، ان کا ریٹ تو ایک روپیہ ہے لوگ چار آنے ٹپ بھی دے دیتے ہوں گے لیکن سیر چشمی ہماری طبیعت میں داخل ہے اس لیے ہم بال کٹا کر اپنی جیب سے حاتم کی قبر نکال کر پہلے اسے ٹھوکر مارتے ہیں پھر اسے ڈیڑھ روپیہ دیتے ہیں۔ وہ خوش ہو جاتے ہیں اور دوہرے ہو کر سلام کرتے ہیں۔ اس لندن کے نائی نے تو ہمارے بال تک نہیں جھاڑے۔ ایک تولیہ ہماری طرف پھینکا کہ جھاڑ لیجیے۔

سیّد سبط حسن کو سوادرد متہ الکبریٰ میں جو دِلّی یاد آئی یعنی لندن میں بشیرا کی قدر

معلوم ہوئی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یورپ میں بشیر اقسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دفتر ہو یا گھر۔ آپ خود ہی اپنے چپراسی۔ خود ہی اپنے چوکیدار، آبدار، خاص دار، خاصاماں وغیرہ، اور گھر کی بی بی خود ہی اپنی آیا، چھوچک، مُغلانی، انّا، میراثن، دھوبن اور نائن ہوتی ہے۔ افسر خود ہی فائل پر جو کچھ لکھتا ہے لکھ کر دوسرے کمرے میں دوسرے اہلکار کو دینے کو جاتا ہے گھر والا اور گھر والی دونوں اپنا سودا خود لاتے ہیں خود پکاتے ہیں اور خود ہی برتن مانجھتے ہیں، جھاڑو لے کر گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ اس برِّ عظیم میں انگریز آتا تھا تو یہاں کی گرمی کے باوجود اگر واپس نہ جاتا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے اشارے پر دس آدمی بکلوس باندھے خدمت کو بھاگے آتے تھے۔

سیّد صاحب کو ہم نے اپنا جوتا آپ پالش کرتے اپنے پائپ کی چلّم آپ بھرتے اور اپنی قمیض کا بٹن آپ ٹانکتے اور اپنی پتلون پر استری کرتے دیکھا تو ہم نے ان سے باقاعدہ معافی چاہی کہ ہم تو آپ کو بالکل ناکارہ آدمی سمجھتے تھے۔ آپ تو خاصے سگھڑ نکلے۔ معلوم ہوا پکانا ریندھنا بھی جانتے ہیں۔ کم از کم انڈے تل لیتے ہیں اور توس سینک لیتے ہیں۔ گھر کے کام کاج سے بخوبی واقف ہیں اگر ان کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو ہم ان کے لیے کسی تعلیم یافتہ برسرِ روزگار لڑکی کا بَر تلاش کرتے۔ سیّد صاحب کو

سب سے زیادہ تکلیف صُبح کی چائے یعنی بیڈ ٹی کی ہے۔ وہ صُبح صُبح اُٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سحر خیزی کی عادت کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ چرند پرند کی بات اور ہے اُن کے تو بستر نہیں ہوتے اور پھر اُن کو اُٹھ کر چوگا بھی تلاش کرنا ہوتا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے بستر رکھتا ہے۔ خیر تو سیّد صاحب اُٹھتے ہی ہائے بشیرا کا نعرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے دنیا میں اور کچھ نہیں بشیرا چاہیے۔ ان سے پہلے مرزا سودا بھی اپنے قصیدے میں حرص نامی شخص سے کہہ چکے ہیں کہ دنیا کی ساری چیزیں تُجھے مبارک، میں اور ساتھ میرے میر ابسنت خاں ہو۔ اب وہ جلد ہی کراچی لوٹنے والے ہیں اور ہمیں ان پر رشک آرہا ہے۔ یہ نظم بشیرانامہ ہم نے انہی کے لیے کہی ہے۔ انہی کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

بشیرانامہ

ہم نے کل جب دل کو چیرا   صبر کا پایا ختم ذخیرہ

جیب میں بھی اب پاؤنڈ نہ لیرہ   ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

جب ہم دس کا نوٹ دکھائیں   تب اک گوشت کا ٹکڑا پائیں

وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ		ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

ساڑھے چھ میں اِک خربوزہ		آٹھ روپے میں آدھا چوزہ

ڈیڑھ روپے کا چھوٹا کھیرا		ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

ہوٹل ووٹل، ٹیکسیاں کاریں		سبھی ہماری کھال اُتاریں

جان کے آغاخاں کا نبیرہ		ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

سات روپے میں بال کٹا کر		گھاٹ پہ خود لادی لے جا کر

روئے بیٹھ کے بھگت کبیرا		ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

کون ہمارا شُو چمکائے		صُبح سویرے چائے لائے

دِل اپنا بے حد دِل گیرا		ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

تن میں اپنے جان نہیں ہے		منہ میں اپنے پان نہیں ہے

کیسا زردہ؟ کون خمیرہ؟		ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

جان بچے تو لاکھوں پائیں　　　　خیر سے اب ہم گھر کو جائیں

دیکھ لیا یورپ کا وطیرہ　　　　ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

لندن میں ہم رہے تو بہت دِن لیکن ان میں سے آدھے سوٹ کیس کو چابی لگوانے اور آدھے جوتا گٹھوانے میں گزر گئے۔ چابی کا قصّہ یہ ہے کہ سیّد سبط حسن کے ایک دوست اپنا سوٹ کیس جس میں ان کے پرانے میلے کپڑے بھرے تھے لندن چھوڑ گئے تھے اور سیّد صاحب سے کہہ گئے تھے کہ اسے بُک کرا کے لیتے آنا۔ دیکھا تو اس کی چابی نہیں تھی اور تالا بند نہ ہو تو ائیر کمپنی والے سامان قبول نہیں کرتے۔ آخر انہوں نے سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھایا اور چابی بنوانے کے لیے نکلے۔ بازار دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ کبھی اس ہاتھ میں لیتے۔ وہ تھک جاتا تو دوسرے ہاتھ میں۔ ہمارے ایک ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ ورنہ ہم ضرور ان کا بوجھ بٹاتے۔ کوئینز وے پر اس سِرے سے دوسرے سِرے تک گھوم گئے۔ جانے یہ لندن والے کیسے لوگ ہیں۔ جوتے، کپڑے، بسکٹوں، مٹھائیوں، بجلی کے سامان سگرٹوں اور الا بلا چیزوں کی دوکانیں تو بہت ہیں لیکن جو سب سے ضروری چیز ہے یعنی تالوں کی گمشدہ چابیاں بنانا۔ بس وہی نہیں ہے۔ ایک جگہ پوچھا تو دوکاندار نے بغیر ہماری طرف دیکھے ایک طرف کو ہاتھ سے اشارہ کر کے

کہا۔ اُدھر چلے جائیے Around the corner ہے۔ ہم اگلے موڑ پر گئے۔ وہاں کوئی نشان نہ ملا۔ ایک سگریٹ فروش سے پوچھا۔ اس نے کسی اور طرف اشارہ کیا اور Around the corner آخر ایک بڑے اسٹور میں گئے وہاں معلوم ہوا کہ Key Cutter یعنی چابی بنانے والا ہے۔ اس نے سوٹ کیس کو دیکھتے ہی سر ہلا دیا کہ جناب ایسی چابی نہیں بن سکتی۔

وہاں سے ہم انڈر گراؤنڈ ریل کے اسٹیشن پر پہنچے اور آکسفورڈ سٹریٹ پر اترے۔ وول ورتھ Woolworth کے ہاں دنیا بھر کی چیزیں اور دنیا بھر کے کام ہوتے ہیں۔ وہاں ایک سٹال پر لکھا تھا کہ یہاں تالے کی چابیاں بنائی جاتی ہیں اور جوتوں کی ایڑیاں لگائی جاتی ہیں۔ ہم نے کہا:۔

"حضرت اس کی چابی بنا دیجیے!"

اس نے کہا۔۔۔ "جی مُجھ سے نہیں بنے گی اس کی چابی۔۔۔ میں تو مکانوں کے دروازوں کی چابیاں بناتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔۔۔ "اچھا تو ہمارے جوتے کی ایڑی گھِس گئی ہے یہ لگا دیجیے۔"

ہم نے سوچا بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی لیکن اس نے اس کے لیے بھی معذرت کر دی اور کہا کہ ایڑی تو کسی ورکشاپ ہی میں لگ سکتی ہے۔ کسی جوتے والے کے ہاں جایئے۔ اب چابی کی طرف سے مایوس ہو کر ہم نے جوتے والوں کی دکانوں کے چکّر کاٹنے شروع کیے۔۔۔ خدا خدا کر کے ایک موچی نے ہامی بھری کہ ہاں بن جائے گی ایڑی لیکن تلا بھی گھِس گیا ہے۔

"وہ بھی لگا دیجیے اور کل دے دیجیے کیونکہ ہم پرسوں جا رہے ہیں"

"لگ جائے گا"

"ہدیہ کیا ہوگا"

بولے۔۔۔ "پچیس شلنگ گیارہ پنس۔" (پاکستان والے بس اتنے ہی روپے سمجھیں)

ہم نے جوتے کو گھما کر عین اس کی دوکان اور نظروں کے سامنے کوڑے کے ڈرم میں پھنک دیا اور تھیلے سے نکال کر دوسرا جوتا پہن لیا جو رستے سے خرید لائے تھے کیونکہ یہ جوتا جو ہم نے پھینکا کراچی سے ہم نے ٹھیک پچیس روپے گیارہ آنے میں

لیا تھا۔

ہاں چابی کا مسئلہ بھی آخر حل ہوا۔ ہم نے کہا۔۔۔ ''ہمارے سوٹ کیس کا تالا بھی تو ایسا ہی ہے اور اس کی دو چابیاں ہمارے پاس ہیں۔ اسے لگا کر دیکھیے تو۔''

سیّد صاحب نے ڈرتے ڈرتے لگائی اور وہ کھٹ سے لگ گئی۔۔۔!

سیّد صاحب کو ہم نے گاذرِ ملّت کے علاوہ کولمبس وقت کا خطاب بھی دیا ہے انہیں ہمارے محلّے میں آئے دو ہی دِن ہوئے ہیں لیکن اب انگریز تک ان سے راستہ پوچھتے ہیں۔ ٹیوب اسٹیشن سے ہمارے گھر کا نزدیک ترین راستہ بھی انہیں نے دریافت کیا۔ وہ تو عدیم الفرصت ہیں ورنہ کے ٹو وغیرہ سر کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہوتا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ بیکر اسٹریٹ سے واٹرلُو جاتے ہوئے ہم تین بار غَلَط گاڑی میں سوار ہوئے اور انہوں نے تین بار ہمیں زبردستی باہر نکلا۔ چند دِن اور یورپ میں رہ گئے تو گائیڈ کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔

جرمنی

۱۲ اکتوبر تا ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء

اب ہم فرینکفرٹ میں ہیں

انگریزوں کو دعویٰ تو انگریزی دانی کا ہے لیکن ڈھنگ سے بولنی نہیں آتی۔ ہمارے پلے بس ان کی آدھی بات پڑتی ہے۔ کبھی وہ بھی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قسمت ہی تھی جو ہمیں لُفتانزا کا جہاز مل گیا۔ ہم لدے پھندے لندن ائیرپورٹ کی عمارت پر انتظار کرتے رہے کہ اب ہانک پڑتی ہے۔ اس دوران مائیکروفون پر کُچھ گنگناہٹ ضرور ہوئی لیکن ایسی کہ ہم نے اسے قابلِ اعتماد نہ جانا جب خاصی دیر ہو گئی تو ڈسک پر جا کر پوچھا کہ "بی بی جی۔۔۔ یہ جرمن ائیر لائن لُفتانزا کا جہاز نمبر ۲۲۳ جاتا کب ہے۔"

"کون سا جہاز؟" بی بی نے پوچھا

"فرینکفرٹ والا۔"

بولیں۔ ”وہ تو چلا گیا۔ آپ کہاں تھے؟“

ہم نے بتایا کہ ”کافی پی رہے تھے۔“

اب وہ بیچاری بھاگیں۔ بولیں۔ قاعدے سے تو چلے جانا چاہیے لیکن شاید ایک برآمدے سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں مسافروں پر گرتے پڑتے۔ ایکسوزمی۔ ایکسوزمی کہتے کہتے ایک جگہ پہنچے جہاں مسافروں کو کوچ لے کر ہوائی جہاز تک جاتا ہے کیونکہ آخر لندن کا ٹریفک ہے جہاز اس عمارت سے کوئی پون میل دور اترتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی کہا۔ آپ کی قسمت کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے ہمیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور ہری لال روشنیوں کی پروانہ کرتے ہوئے سرپٹ بھاگا ہمارے وہاں پہنچنے تک سیڑھی اُٹھالی گئی تھی۔ لیکن ہم نے۔۔۔ ”ارے ظالمو، جرمنو کیا کرتے ہو۔ پھر لگاؤ سیڑھی۔ آخر ہم نے کرایہ دیا ہے۔ مُفت تھوڑی جارہے ہیں۔ ان کو ہمیں سوار کرتے ہی بنی۔ ورنہ ہمارا سامان جو پہلے ہی بار ہو چکا تھا۔ فرینکفرٹ چلا گیا ہوتا اور ہم خالی لندن میں ٹاپتے رہ جاتے۔“

ع ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور

ہوٹل زیپلن۔۔۔ سبحان اللہ کیا عمدہ ہوٹل ہے۔۔۔ یہ پہلا ہوٹل ہے جس کا غسل

خانہ چھوٹا ہونے کی ہم شکایت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ساتھ غسل خانہ ہی نہیں۔ ہم نے آتے ہی منیجر صاحب سے کہا۔ ''یہ کیا غیر معقولیت ہے۔ آپ ہمیں کمرہ دیں یا نہ دیں۔ ہمیں غسل خانہ ضرور چاہیے۔ ہم نہانے دھونے والے آدمی ہیں۔'' بولا۔ ''جناب یہ بھی غنیمت جانیے کہ آپ کا پیغام ڈیڑھ مہینے پہلے مل گیا تھا۔ اس لیے کمرہ آپ کے لیے ہم نے ریزرو کر دیا ورنہ فرینکفرٹ کتاب میلے کا رش ایسا ہے کہ کسی ہوٹل میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں۔ آپ کے فلور پر ایک مشترکہ غسل خانہ ضرور ہے لیکن وہ ایک امریکن جوڑے نے ریزرو کر رکھا ہے۔ وہ دو دِن بعد چلا جائے گا تو شوق سے دِن بھر ٹب میں بیٹھ کر اشنان فرمایئے گا۔''

''ٹائلٹ تو ہے نا؟ یعنی آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں۔''

''جی ہاں وہ ہے اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے آپ کے کمرے میں وہ چیز بھی ہے آپ سمجھتے ہیں نا؟''

''جی ہاں شکریہ!''

پیرس والے غسل خانے کا احوال ہم لکھ چکے۔۔۔لندن میں مسز واٹسن کی سرائے میں جو گلوسٹر ہوٹل کے بھاری بھر کم نام سے معروف ہے۔ ہم دوسرے لوگوں سے ڈیوڑھا کرایہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے ایک کونے میں شاور بھی تھا۔ یعنی اس قسم کا ڈبّہ جس کے اندر آدمی کھڑا ہو سکتا ہے لیکن ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا۔ سیّد سبط حسن نے کہا۔ "میاں کیا کِیا جائے۔ اُوپر کا آدھا دھڑ تو نہا لیا ہوں۔ ٹانگوں پر صابن۔ کیسے لگاؤں اور پانی کا تریڑا بھی بس سر سے چھاتی تک آتا ہے۔

ہم نے کہا۔۔۔"یوگ ودیا سیکھی ہے آپ نے؟"

بولے "ہاں کُچھ کُچھ تو پڑھا ہے۔"

"تو شیر شک آسن کیجیے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔" سیّد صاحب نے پوچھا۔

"سر کے بل کھڑے ہو جائیے اور ٹانگیں اوپر کھڑی کر لیجیے۔ پنڈت نہرو یہی کیا کرتے تھے۔ تبھی تو ان کو ہر چیز اُلٹی نظر آتی تھی۔"

"اُن کا غسل خانہ بھی چھوٹا تھا کیا؟"

واللہ اعلم۔۔۔ ویسے چھوٹا نہ ہوتا تو ان کو سر کے بل کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ یا پھر پرانے زمانے کے شاعر کوچۂ رقیب میں اس شان سے جاتے تھے لیکن نہرو جی شاعر تو نہ تھے اگرچہ شاعری کیا کرتے تھے۔ ہوٹل زیپلن میں بس یہ ایک تکلیف تو ہے اور تکلیف بھی کیا ہے۔ بھلا ہوا مری گاگر یا ٹوٹی پانی بھرن سے چھوٹی۔ نہ نہانے کا معقول عُذر مل گیا۔ مسلمان یوں بھی جُمعے کے جُمعے نہاتا ہے اور اگلے جُمعے میں ابھی کئی روز ہیں۔ باقی ہر لحاظ سے یہ ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔ مسز واٹسن کے ہاں ایک مہینہ گزارنے کے بعد تو اور بھی زیادہ آرام دہ معلوم ہونے لگا ہے۔ فرش پر قالین ہے، تولیے روز بدلے جاتے ہیں۔ مسز واٹسن سے اُس روز سیّد صاحب نے نیا تولیہ مانگا تو بولیں۔ ڈیڑھ پاؤنڈ روز میں تو نیا تولیہ ملنے سے رہا۔ ہمارے اس کمرے میں چار روشنیاں ہیں اور ہم چاروں رات بھر جلائے رکھتے ہیں کیونکہ لندن والے کمرے میں ہمیں اپنے پلّے سے روشنی کرنی پڑتی تھی یعنی ہر دوسرے تیسرے دِن میٹر کو رشوت دیتے تھے۔ اُس کی جیب میں ایک شِلنگ ڈالنا پڑتا تھا۔

ابھی اس روز ہم ایک خط لکھنے کو بیٹھے۔ ابھی خیریت موجود خیریت مطلوب تک پہنچے تھے اور غیب سے مضامین خیال میں آنے شروع ہوئے تھے کہ کھٹک سے بجلی بند۔ یہ شِلنگ والی بجلی انسانی زندگی کی طرح ہے۔ اِس کا کچھ اعتبار نہیں۔۔۔ ہم نے سوچا

ماچس جلا کر اپنا کوٹ تلاش کریں کیونکہ معلوم نہیں کِس کُرسی، کِس صوفے یا پلنگ پر پڑا ہے۔ کھونٹی پر ٹانگنے کے ہم قائل نہیں۔ پھر اس میں سے شِلنگ نکالیں لیکن روشنی ہوتی تو ماچس ہمیں ملتی۔ خُدا جانے کہاں رکھی ہو۔ پہلے ماچس ڈھونڈنا اور اِس کوشش میں دھڑ ادھڑ چیزیں گِرانا۔۔۔ پھر کوٹ ڈھونڈنا اور پھر اُس کی کئی جیبیں۔ اُن میں سے شِلنگ ڈھونڈنا۔ پھر میٹر ڈھونڈنا۔ اُس کا سوراخ ڈھونڈنا بڑا طول عمل تھا۔ ہم نے خط اور مضامینِ غیب کے لیے اگلے روز کی تاریخ ڈال دی اور بستر پر دراز ہو گئے۔ رات کو جانے کِس وقت سیّد سبط حسن آئے ہوں گے۔ ماچس جلائی ہو گی۔ میٹر کا مُنہ شِلنگ سے بند کیا ہو گا اور روشنی پائی ہو گی۔ ہمیں کُچھ معلوم نہیں۔

ہم جرمن زبان پر بھی حاوی ہو گئے

جرمن کے متعلّق سُنا تھا کہ مُشکل زبان ہے۔ جن کے لیے مشکل ہو گی، ہو گی، ہمیں تو اِس کے سیکھنے میں چنداں دِقّت نہ پیش آئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ ہماری طبعی ذہانت ہو۔ ہم یہ دعوے نہیں کرتے کہ ہم گوئٹے اور شِلر کی زبان کی باریکیوں پر تنقید کر سکتے ہیں یا جرمن زبان کی صرف و نحو پر کتاب لکھ سکتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ ہوٹل میں جا کر بے تکلّفی سے کھانا مانگ سکتے ہیں اور راستہ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک بڑی نادرِ روزگار کتاب ہمارے ہاتھ آ گئی جس میں کھانوں کے انگریزی نام اور اُن کے جرمن مترادفات لکھے ہیں جس کی وجہ سے ہم کمرے کی کُنڈی لگا کر خشک بسکٹ نگلنے اور پانی پینے سے بچ گئے۔ اُس میں لکھا تھا کہ راستہ پوچھنا ہو تو پہلے کہو Wo ist جس کا مطلب ہے "کہاں ہے؟" اس کے بعد مقامِ مطلوبہ کا نام لو۔ از راہِ اخلاق Bitte (پلیز) بھی کہو۔ وہ جواب میں کہے گا۔ ناخ ریشتس Nach

Recht یعنی دہنی طرف یا ناخ لینکس Nach Links یعنی بائیں ہاتھ یا یہ کہ سیدھے چلے جاؤ گیرادے اوس Geradeaus اس کے بعد تُم دانکے شرن (شکریہ) کہو اور اپنی راہ لو۔
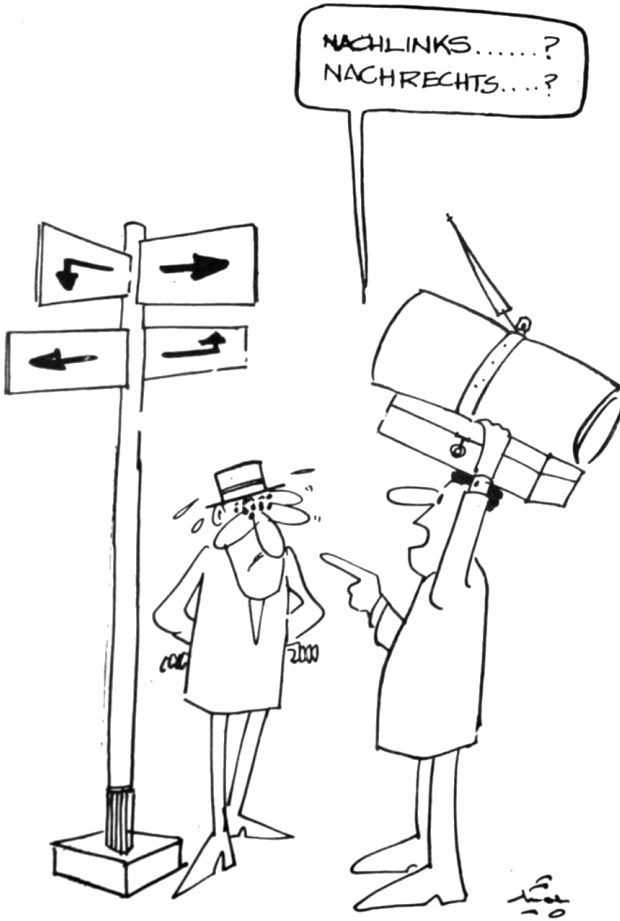
اب یہ تمام فقرات ہمارے وردِ زبان ہیں۔ عام طور پر ہمارا مطلوبہ مقام دہنے ہاتھ، بائیں کو یا سیدھا آگے ہوتا ہے، البتّہ اگر کہیں ہم اُسے پیچھے چھوڑ آئے ہوں اور ایک سے زیادہ موڑ مُڑنے کی بات ہو یا ہمارا دیا ہوا پتہ شہر کے دوسرے حصّے میں یا کسی دوسرے شہر میں ہو تو تھوڑی دِقّت ہوتی ہے مخاطب جرمن میں ایک تقریر کرتا ہے ہم یا۔۔۔ یا (ہاں۔ ہاں) کہنے کے بعد سر ہلا کر دانکے شرن کہتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کوئی تو ملے گا جو ہماری جرمن زبان کی معلومات کے اندر رہ کر ہمیں بتائے گا۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

الانسان مرکّب من الخطاد النسیان بے شک زبان پر ہمیں اس حد تک عبور حاصل ہو گیا ہے تاہم احتیاطاً ہم یہ فقرے اور الفاظ ایک پرچی پر لکھ مع اُردُو حروف میں اُن کے تلفّظ کے، اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور یہ پرچی جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کتاب کا لکھنے والا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سخت اُبلے ہوئے انڈے کھانے کا شوقین تھا۔ ہم ہاف بوائلڈ کھاتے ہیں یا ہاف فرائیڈ۔ اُس نے اِس باریکی کا ذکر ہی نہیں کیا۔

لہٰذا ہمیں بھی سخت اُبلا ہوا انڈا کھانا پڑتا ہے، یا پھر کل یہ ہوا کہ ہم نے بھُنی مُرغی کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر میں بیرا یعنی بیری ایک بڑا سا قدحہ اُٹھا لائی۔ معلوم ہوا ہے کہ ہم رواروی میں بھُنا مُرغ Braf Huhn کی بجائے Huhner Bruhe (مُرغی کا سوپ) کہہ گئے۔ زیادہ علم وسیع ہونے کا یہی تو نقصان ہے۔ ہم نے صرف ایک ہی لفظ یاد کیا ہوتا تو یہ قباحت کیوں ہوتی۔ ہم چاہیں تو جرمن زبان میں منشی فاضل کی ڈگری لا سکتے ہیں لیکن کیا فائدہ بلکہ دانستہ احتیاط کر رہے ہیں کیونکہ ابھی ہمیں پولینڈ وغیرہ جانا ہے۔ اُن لوگوں کی جرمنی سے لڑائی رہی ہے، کسی نے ہمیں جرمن سمجھ لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ بھی جو کچھ سیکھا ہے اسے ہم جرمنی کی سرحد پر بھلا کر آگے جائیں گے۔ جیسے اپنی فرنچ زبان ہم فرانس کی سرحد کے اِدھر چھوڑ آئے ہیں۔ یوں بھی اتنا سامان کون اُٹھائے اُٹھائے پھرے۔

بون اور کولون میں گرجا اسی طرح ایک پر ایک چڑھے ہوئے ہیں جس طرح استنبول میں مسجدیں اور شان میں بھی یہ استنبول کی مسجدوں پر چشمک زنی کرتے ہیں۔ کولون کے گرجا کو دیکھیے اس کی رفعت عظمت اور ہیبت آپ عُمر بھر نہیں بھُلا سکتے۔ فرینکفرٹ سے آتے ہوئے ہم نے اُفق پر گرجاؤں کے نکیلے کلس بھی دیکھے ایک تو ان میں قلہ کوہ پر بھی ہے خود ہمارے ہوٹل کے نواح میں پانچ چھ پرانے

کلیساہیں۔ شام کو ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کیا دِلاویز سُریلی تانیں اُڑا رہی تھیں۔ دِل والوں کو برگِ درختاں سبز ہی معرفت کردگار کے لیے کافی ہیں۔ یہ گھنٹیاں تو پھر صدا رکھتی ہیں۔

ایک تو تنہائی کا عذاب جس کے باعث بعض اوقات گھنٹوں بستر پر پڑے یورپ کا نقشہ دیکھا کرتے ہیں، پھر سیر کرانے والے دُکان اپنی بڑھا گئے ہم نے پوچھا ٹورسٹ آفس سے کہ ہے کوئی جو ہمیں شہر دِکھائے، دریائے رائن کی سیر کرائے اور اپنے ملک کے لیے ہم سے فارن ایکس چینج کمائے۔ لیکن جواب ملا "نائیں" یعنی نہیں۔ ۳۰ ستمبر کے بعد جاڑا فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ تمام تفریحی کاروبار ٹھپ۔ سیاح کو چاہیے کہ کمرے میں بیٹھ کے انگیٹھی تاپے آخر ہم نے خود ہی رائن کی راہ لی، معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل ہمارے ہوٹل کے پچھواڑے واقع ہے، یہ سیر ہماری بون میں آمد کا حاصل کہیے، کیا خوبصورت سیر گاہ ہے، یا پھر ہم نے برسوں پہلے ہالینڈ اور بلجیئم کی سرحد کنوک کے ساحل پر ایسا پایا تھا۔ کشتیاں بھی آ جا رہی تھیں، لیکن اُن پر جِن منزلوں کے نام لکھے تھے وہ ہمارے نقشے میں نہ نکلیں ممکن ہے چھوٹی بستیاں ہوں اور کیا عجب سو دو سو میل دور ہوں لہٰذا ہم نے خطرہ مول نہ لیا۔ بینچ پر بیٹھ کر لوگوں کی طفلانہ شوخیوں کو دیکھتے رہے یہاں ہپّی وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن جوڑوں کا

عالم یہاں بھی یہی ہے کہ

ع چھاتی سے لگا چوم لیا ہو گئے چپکے

پھر اٹھ کر کینڈی پل کے ادھر سے دوباذ شہر میں داخل ہوئے۔ ادھر ہی کہیں بیتھوون کا گھر تھا۔ جی میں آئی کہ اسے بھی دیکھ چلیں۔ بیتھوون کا نام ہمارے جن قارئین نے نہ سُنا ہو ان کو معلوم ہو کہ یہ جرمنی کا نامور میراثی تھا۔ گانوں کی دُھنیں بنایا کرتا تھا۔ ہم نے بھی ایک آدھ بار جب ریڈیو بند کرنا بھول گئے ہیں اس کی سمفنی سُنی ہے۔ کیا بات ہے اس کی۔ لاجواب آدمی تھا۔ ہم سے تو ایسی دُھن کبھی نہ بنے۔ ہم اپنی طرف سے تو ٹھیک چلے لیکن راستوں کی بھُول بھلیّوں میں گُم ہو گئے۔ ایک جگہ ایک مرد بزرگ، لانبی سفید داڑھی چہرے پر دانش کی تحریر پیشانی پر بھویں آنکھوں پر سایہ کیے ایک گلی کے موڑ پر کھڑے مل گئے۔ ہم نے تو جرمن میں پتہ پوچھا۔ جب جرمن آتی ہے تو کیوں نہ بولیں لیکن ان بزرگ نے انگریزی میں کہا۔ ”بیتھوون کا گھر پوچھ رہے ہو صاحبزادے؟ وہ سامنے پھاٹک ہے اس کے اندر چلے جاؤ۔“ ہم نے کہا ”ہماری کتاب میں تو کوئی اور سڑک لکھی ہے۔ یہ تو قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ اس پر دقیانوس نے فرمایا۔ ”بیٹا جی! بیتھوون صاحب اب تمہیں اس سڑک پر اس گھر میں نہ ملیں گے۔ وہ تو بہت دِن ہوئے مر گئے۔ پھاٹک کے اندر

چلے جاؤ داہنے ہاتھ دیوار کے ساتھ دس نمبر کی قبر ہے۔

اور یوں اس مردِ دانا نے ہمیں بون کے "قبرستان" آلٹر فریڈہوف میں پہنچا دیا اور ہم نے بیتھوون کی ابدی آرام گاہ دیکھ لی اور وہاں سکوں کا وہ نغمہ سُنا جو قبرستان کی چار دیواری کے باہر نہیں جاتا۔ یہ قبرستان اہلِ کمال کا گنج شائیگاں ہے۔ جگہ جگہ مٹّی کے ڈھیر اور ان پر فلاسفروں، سائنسدانوں، شہرہ آفاق طبیبوں، پروفیسروں کے ناموں کی تختیاں۔ ہر قبر پر سدابہار پودے ہیں۔ کہیں کہیں چراغ نما لالٹین بھی، کیونکہ جھٹ پٹا ہو رہا تھا۔ قبریں زیادہ تر پچھلی صدی کی۔ کچھ اس صدی کے شروع میں مرنے والوں کی بھی، بعض دوسری جنگ سے چند سال پہلے کی، بعض قبروں کے سرہانے مجسّمے بھی تھے۔ عام طور پر ایک خاندان کی قبریں سب یکجا۔ اس وقت تک سب لوگ آکر جا چکے تھے۔ ان درختوں کے سائے اور دم بدم اُترتے ہوئے اندھیرے ہیں یہ دور دیس کا راہی تنہا تھا کبھی گرے کا مرثیہ یاد آتا تھا۔ کبھی کل من علیہا فان کا حکم۔ بڑے بڑے خطیب خاموش تھے۔ مسیحا نقشِ محوِ خواب عدم تھے۔ مشرق و مغرب کی فتح کا خواب دیکھنے والے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے والے، صحرا صحرا گھومنے والے صاحبانِ انکشاف و ایجاد، وہ لوراں سیماب پا اب اپنی دو گز زمین کے احاطے میں مست و مطمئن لیٹے آرام کر رہے تھے۔

چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر

سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

کھانا ہمارا سیب

یہاں باڈ گوڈسبرگ میں ایک عظیم الشّان ادارہ ہے جس کا نام کلچرل ایکس چینج کا انصرام وغیرہ ہے اس کا جرمن نام ہم لکھیں تو ایک تو یہ قباحت ہے کہ ہجّے کی غَلَطی کر بیٹھیں گے۔ دوسرے وہ ایک آدھ سطر میں نہیں آئے گا۔ اٹھارہ اٹھارہ حرفوں کے الفاظ تو جرمن زبان میں عام ہیں لیکن اب یہ بھید کھلا کہ گھبرانے کی بات نہیں محمد حسن عسکری والے استاد صبر سہارن پوری کے کلام کی طرح یہاں حرفوں کو ملا کر لکھنے کا رواج ہے۔ کیلے کی گیلی جڑ کو یہاں کیلیکیگیلیجڑ لکھیں گے۔ آخر ہم بھی تو آجشب کو ملا کر لکھتے ہیں اور پڑھنے والے اسے آجش بکو پڑھتے ہیں۔ لکھنے میں جگہ بچتی ہے اور کاغذ کی مہنگائی تو عالمگیر ہے۔

ہم ہر چند کہ جرمن حکومت کے مہمان نہیں لیکن جس بین الاقوامی ادارے کے

فرستادہ ہیں اس نے جرمنی کی حد تک ہماری دیکھ ریکھ اسی جرمن ادارے کے سپرد کر رکھی ہے اور واقعی نومان صاحب نے جو ہمارے پروگرام کے ذمہ دار ہیں۔ حقِّ میزبانی خوب ادا کیا اور مس مونیکا شٹمز تو مہربانیوں میں ان سے بھی بڑھ گئیں۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو خوبے دیگری۔ قارئین کرام اپنے تخیّل کو بے لگام نہ ہونے دیں اور بانوانِ پاکستان رشک سے اپنی انگلیوں کو نہ چبا ڈالیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ باڈگوڈسبرگ ہی میں ہمارا سفارت خانہ ہے۔ ارشد الزّمان سے ملنے وہاں گئے تو سفیر صاحب کو بھی سلام کیا۔ خان عبد الرحمان خاں ہمارے بڑے کامیاب ڈپلومیٹوں میں سے ہیں لیکن طبیعت اور گفتگو میں بالکل سادہ۔ فرماتے ہیں میاں میں تو دیہاتی آدمی ہوں۔ مجھ کو لکھنوئیت نہیں آتی، اور جرمن لوگ مجھے اس لیے پسند ہیں کہ سیدھے سادھے پٹھان لوگ ہیں۔ باتوں کے طوطا مینا نہیں بناتے۔ کوئی بات انہیں خوش آتی ہے تو ٹھیک ورنہ صاف جواب۔ پاکستان کے سچّے دوست ہیں۔ مدد دینے میں دوسروں سے آگے خود اعتمادی کے مالک ہیں۔ کسی کے دباؤ میں نہیں آتے۔ پھر بہادر ہیں سارے جرمنی میں ایک بھی نکمّا یا احدی آدمی نہ ملے گا نہ کسی کو کمزور یا مدقوق پاؤ گے۔

گزشتہ اتوار کو کولون میں ہمارا سیب کھانے کو جی چاہا تھا۔ پونے دو مارک کے تین

آئے تھے۔ آج دوپہر ہم مارکیٹ کی طرف جانکلے تو ریڑھی پر سیب دیکھ کر پھر جی للچایا اور انگریزی محاورہ بھی یاد آیا کہ سیب کھاؤ اور ڈاکٹر کو بھگاؤ۔ پاکستان میں تو خود ڈاکٹر سیب کھاتے ہیں اور فیس کا بتا کر ہمیں بھگاتے ہیں۔ ہم نے دُکاندار سے کہا کہ یہ لو ایک مارک جتنے جی چاہے دے دو۔ اس نے ایک بڑا تھیلا اُٹھایا اور اس میں پندرہ بیس بھر دیے۔ ہم نے کہا اے بھلے مانس فقط ایک مارک کے دے۔ ہم خوردہ فروش دُکاندار نہیں ہیں کہ ان سیبوں کی ریڑھی لگائیں۔ فقط ذاتی استعمال کے لیے چاہتے ہیں۔ اس نے کہا جناب یہ ایک ہی مارک کے ہیں۔ وہاں سے جانا تو ہمیں کسی اور طرف کو تھا لیکن اس بوجھ کی وجہ سے سیدھے ہوٹل آئے۔ سیب کو بالعموم دانتوں سے یونہی کچر کچر کھایا جاتا ہے۔ آخر سبھی حیوان ایسے کھاتے ہیں تو انسان میں کونسا سُرخاب کا پر لگا ہے لیکن اس وقت طبیعت ذرا مائل بہ نفاست تھی۔ ہم نے ہوٹل کی داروغن صاحبہ سے چاقو چھری وغیرہ کی فرمائش کی تاکہ کاٹ کاٹ کر کھائیں۔ اتّفاق سے وہ ڈکشنری جو جرمن زبان میں ہمارے علم و فضل کی ذمّہ دار ہے۔ ہم اوپر کمرے میں چھوڑ آئے اور چھری کی جرمن ہمیں زبانی نہیں آتی۔ داروغن صاحبہ کو انگریزی میں دخل ضرور ہے لیکن بس ایسا ہی جیسا ہمیں جرمن میں ہے۔ ہم نے کہا ”نائف چاہیے، ایپل کاٹنا ہے“ ان کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا۔ تو ہم نے ایک ہاتھ میں

خیالی سیب رکھ کر دوسرے میں خیالی چھری لی اور اسے کاٹا۔ بے چاری کُند ذہن پھر بھی نہ سمجھی۔ اب ہم نے بریک فاسٹ کا حوالہ دیا اور اشاروں میں توس پر چھری سے مکھّن لگایا۔ یہ اشارہ بھی مکھّن لگانے سے زیادہ نائی کے استرا تیز کرنے سے زیادہ قریب ہو گیا۔ لٰہذا ہم نے خیالی سیب کو پھر دو ٹکڑے کیا۔

یکایک محترمہ نے چہک کر کہا ”سیوب؟“

ہم نے بھی خوش ہو کر کہا ہاں ہاں ”سیب“ اتنی دیر سے یہی تو کہہ رہا ہوں کہ سیب کاٹنا ہے۔ اب لاؤ چھری۔

ایک روز ہم نے پائن ایپل مانگا تھا تو دُکاندار نے کہا ”اناس؟“ تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں یہ پھل اناس ہی کہلاتا ہے۔ اب یہاں بھی ہم اتنی دیر سے ”ایپل“ کاٹنے کی بات کر رہے تھے۔ شروع ہی میں سیب کہہ دیتے تو یہ فوراً سمجھ جاتیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کسی نے اُردُو اور جرمن زبان کے مشترک الفاظ پر اب تک کچھ نہیں لکھا۔ کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ کسی کو جرمن آتی ہی نہیں تھی۔ ہم نے طے کیا کہ عدیم الفرصتی کے باوجود وطن واپس جا کر ہم اس موضوع پر محققانہ مقالہ لکھیں گے۔ ایک تو یہ سیب ہی مشترک نکلا اور بھی بہت سے الفاظ ضرور مشترک ہوں گے۔

اتنے میں محترمہ برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں نہانے کے صابن کی ایک ٹکیہ تھی۔ بولیں ”یہ لو سیوب۔“

آنا برلن اور ٹھہرنا کفرستان میں

برلن۔ برلن۔ برلن! اے صاحبو حفاظتی بند باندھ لو، برلن آیا جاتا ہے کسی اور شہر کے سواد میں جی پر وہ ہیبت طاری نہیں ہوتی جو برلن پہنچنے پر ہوتی ہے بشر طیکہ آنے والا کھالوں کا تاجر اور محض ایکسپورٹر امپورٹر نہ ہو۔ یہ شہر ہے پرشیا کی سطوت و جبروت والے بادشاہوں کا، شاہ فیریڈرک اعظم کا، پرنس بسمارک کا، قیصر ولیم کا، ہٹلر کا۔ آگ اور دھوئیں کا۔ ملکوں کی قسمتوں کروڑوں انسانوں کی تقدیروں کے اعلان یہاں سے ہوتے تھے۔ نوشتے یہاں سے جاری ہوتے تھے۔ یہ سڑکیں جن پر اب شگفتہ چہروں والے لوگ چل رہے ہیں اور میاں آزاد ہم بے غل و غش قدم مار رہے ہیں۔ یہاں گسٹاپو کا عمل تھا نازیوں کے جیش پریڈیں کرتے گزرتے تھے۔ سوِستیکا کا جھنڈا لہراتا تھا۔ مائیکروفونوں سے فیوہرر کی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ زنداں آزادی پسندوں سے بھرے تھے۔ نواحات بندی خانوں سے آباد تھے جہاں

لاکھوں بے بس انسانوں کو گیس کی بھٹیوں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ ان کی چربی سے صابن بنتا تھا۔ ان کی ہڈّیوں سے کھاد بنتی تھی۔ اتحادیوں نے آکر ان بندی خانوں کو دیکھا تو فقط زندوں اور مردوں کے ڈھانچے پائے یا گودام در گودام انبار در انبار بچّوں اور بڑوں کے جوتوں کے جوڑے، ان کے جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور آج یہ بلدہ پھر شہر ہے خوشحال خوش باش اور خوش نہاد لوگوں کا۔ انسان عظیم ہے خدایا!

ہمارے میزبانوں کی فرستادہ ایک لڑکی ائیرپورٹ پر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ خوش آمدید ہم نے کہا: "اے بی بی کیا نام ہے تیرا؟"

بولیں: "سُو"

"بہت چھوٹا نام ہے سُو۔" ہم نے کہا۔ "اے نیک بخت! ہم دنیائے سُو اور مردمان سُو اور علمائے سُو نہ جانے کس کس سے بچتے یہاں تک پہنچے ہیں تو ہمیں اپنا اصلی نام بتا۔" تب بولی "بندی کو فرانسسکا کہتے ہیں۔" ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ فرمایا مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہو گا۔ وضاحت بھی کر دی۔ صُبح سے شام تک ہم نے کہا اچھا تو ہمیں اپنا شہر بھی دکھاؤ گی تب۔ اس نے جیب سے ایک لانبا کاغذ نکالا جو چھپا ہوا تھا "پروگرام برائے حضرت ابن انشا آف اسلامک ری پبلک آف پاکستان" ہم نے کہا۔ ہم سے

دفتر نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اتنے لوگوں سے نہیں مل سکتے۔ اتنی لائبریریوں کا ملاحظہ نہیں فرماسکتے۔ سخن کو مختصر کرو ہم سے بون ہی میں میومان صاحب نے کہہ دیا تھا کہ برلن جا کر کام کے جھمیلوں میں نہ پڑ جانا۔ کچھ شہر بھی دیکھنا۔ بولیں۔ اب تو پروگرام بن چکا۔ ان لوگوں کو اطلاعیں ہو چکیں۔ اب ان کو منسوخ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے کہا۔ ہم برینڈن برگ گیٹ پر کب جائیں گے۔ دیوار کب دیکھیں گے مولوی محبوب عالم کا ہوٹل کب تلاش کریں گے پھر مشرقی برلن بھی ہمیں ضرور جانا ہے۔ ہم نے بون میں تمہارے دفتر سے کہہ دیا تھا لیکن وہ بیچاری کیا کر سکتی تھی۔ بولی، شامیں آپ کی خالی ہیں۔ بیچ میں بھی کہیں کہیں ایک دو گھنٹے آپ کو مل جائیں گے۔ ان میں آپ چاہیں تو شاپنگ کر لیں۔ ہم نے کہا بی بی شاپنگ کی بات ہم سے نہ کر کہ ہم تو خود اپنے کو بیچنے نکلے ہیں کوئی دل و جان کا اچھا خریدار ملے تو ہمیں بتانا۔

برلن کہنے کو چار حصّے ہیں لیکن واقعتاً، الگ فقط مشرقی حصّہ ہے سوویٹ سیکٹر۔ دیوار کے پچھلے۔ باقی تینوں یعنی امریکی، برطانوی اور فرانسیسی سیکٹر باہم ملے ہوئے ہیں، انتظام سب کا اکٹھا ہے۔ کوئی چوکی پہرہ نہیں۔ آپ معلوم نہیں کرسکتے کہ ان تینوں میں سے آپ کس سیکٹر میں ہیں۔ سوویٹ سیکٹر یعنی مشرقی برلن۔ وہ البتّہ!
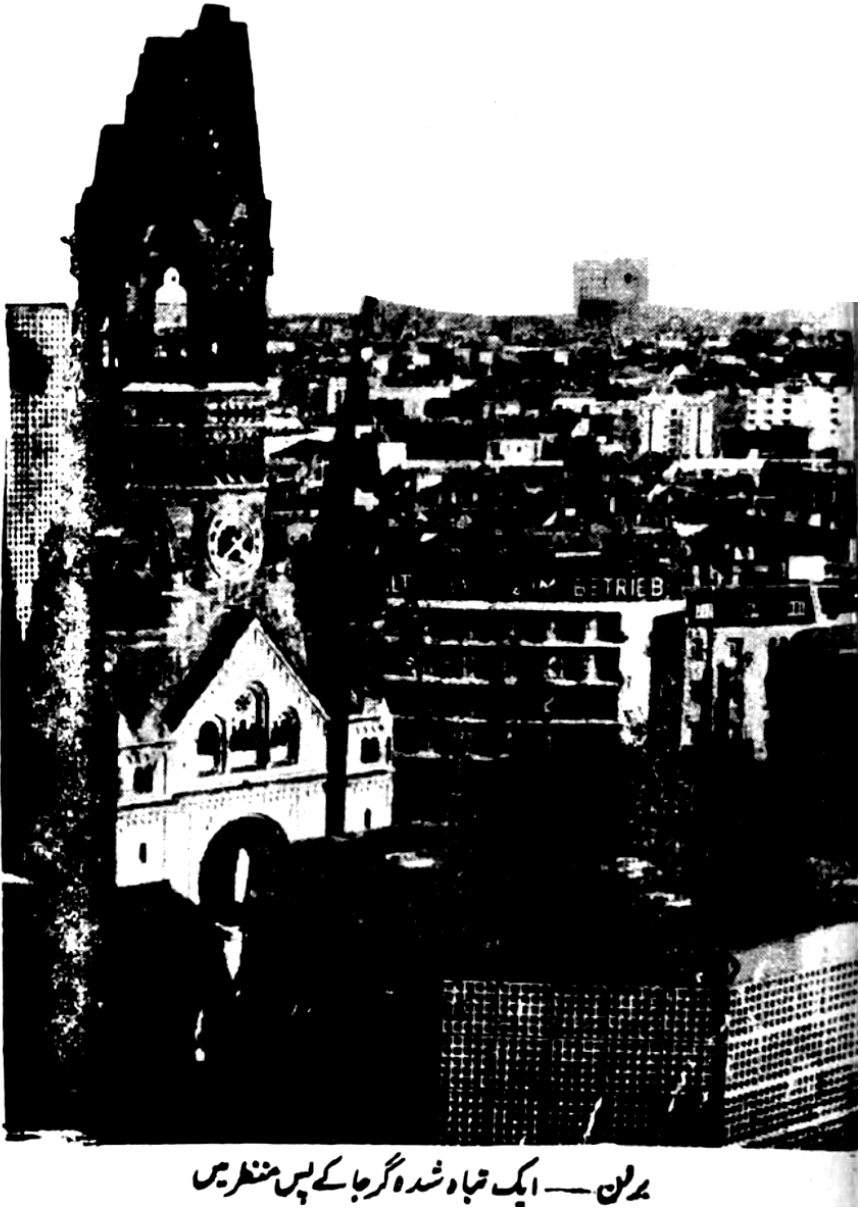
برلن —— ایک تباہ شدہ گرجا کے پس منظر میں

مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام ہے Kurfurten اسے اپنے حساب سے پڑھا تو آواز نکلی۔۔۔ ''کفرستان'' سی پر ہمارے ہوٹل کا نام تھا ''ہوٹل کفرستان'' یعنی کفر کا دُم چھلّہ یہاں بھی ہمارے ساتھ رہا۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

ہم نے پہلے تو احتجاج کرنا چاہا کہ اسلامک ری پبلک کے آدمی کے لیے آپ نے اس نام کا ہوٹل کیوں مقرّر کیا۔ پھر اس خیال سے چُپ ہو گئے کہ اس ہوٹل میں اور اس شاہراہ پر بُتانِ کافر سے مُڈ بھیڑ ہوا کرے گی۔ کیا عجب کوئی موقع تبلیغ کا نکل آئے اور کوئی اُن میں سے راہ راست پر آ کر ہمارے دستِ حق پر بیعت بھی کر لے۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کسی کافر کو تو ہم اپنی راہ پر نہ لا سکے۔ ہاں ہمارا ایمان ضرور کئی بار متزلزل ہوا۔

ہوٹل ہمارا اچھا تھا۔ اتنے دِنوں بعد ڈھنگ کا ہوٹل رہنے کو ملا۔ یورپ میں نجی باتھ روم والا ہوٹل ایک نعمت ہے جو پہلی بار نصیب ہوئی۔ ورنہ کسی نہ کسی حاجت (ضروریہ و غیر ضروریہ) کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ چوغہ یا جھبر جھالا یعنی ڈریسنگ گون ہم نے خاص اسی مطلب سے خریدا۔ فرینکفرٹ والا ہوٹل زیلپن بھی اچھا تھا

لیکن اس کے مقابلے میں نمبر دو۔ بون کا ہوٹل بنز نسبتاً سستا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن منیجر صاحب نے بل بنایا تو اس میں تین مارک کسی چیز کے الگ لگے تھے۔ ہم نے کہا یہ کیا۔ بولیں آپ ایک روز نہائے جو تھے۔ غسل خانہ مشترک سہی لیکن آپ نے استعمال جو کیا ہے تو اس کے پیسے بھی دیجیے۔ ہم نے شکر کیا کہ چار دِن میں فقط ایک بار نہائے۔ ورنہ ہم اپنے حلقے میں پانی کا جانور کہے جاتے ہیں۔ روز نہاتے ہیں۔ ہوٹل بنز میں بھی ہم سے یہ حرکت ضرور ہوتی۔ لیکن ہمیں غسل خانہ ملا ہی نہیں تھا۔ پوچھنا پڑا کہ آخر یہ چیز ہے کہاں؟ معلوم ہوا اوپر چھت پر ہے۔ بیت الخلا میں البتّہ آپ بغیر پیسے دیے مدار پر جاسکتے ہیں بِل میں تین مارک اور لگے تھے۔ ہم نے کہا اس کی وضاحت بھی ہو جائے۔ فرمایا۔

آپ کے کمرے میں کمرہ گرم کرنے کی سلاخیں لگی ہیں نا؟ یہ تین مارک Heating کے۔ ہم نے کہا وہ تو ہم نے استعمال ہی نہیں کیں بلکہ رات کو کھڑکی کھول لیتے تھے تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔ کمرے میں تو حبس تھا۔ بولیں: استعمال کرنے نہ کرنے کی سند نہیں ہے۔ پیسے تو دینے ہوں گے۔ ہم نے حساب جوڑا تو وہی پایا جو اچھے ہوٹل کا ہوتا ہے۔ صرف کُفرستان ہی نہیں اور بھی کئی لفظ ہم نے اپنے حساب سے یاد کیے ناشتے کے لیے جرمن میں بڑا ٹیڑھا لفظ ہے۔ Frustuck ناشتے

کے کمرے پر لکھا نظر آیا۔Fructuckram ۔ ہم نے کہا وہ مارا یہ فرس تکارام کی خرابی ہے۔ سنت تکارام کا نام کس نے نہیں سُنا۔

برلن کا ایک چوک

اگرچہ یہ کون تھے اور کیا کرتے تھے قارئین کرام کی طرح ہمیں بھی معلوم نہیں۔ فرس کا مطلب گھوڑا یعنی سنت تکارام کا گھوڑا۔ ظاہر ہے سنت صاحب کے زمانے میں گھوڑے ہی کی سواری ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جرمنوں نے ناشتے کے کمرے کے لیے یہ بے تُکا نام کیوں رکھا۔ گھوڑے کو ناشتے کے کمرے سے کیا نسبت تا آنکہ یہ رعایت ملحوظ نہ ہو کہ دِلّی والے بھی نہاری کھاتے ہیں اور پنجاب میں تانگے کے گھوڑوں کو جو بھوسی چنے وغیرہ دیے جاتے ہیں وہ بھی نہاری کہلاتے ہیں۔ ہماری تحقیق کا ٹٹّو تو اس میدان میں یہیں تک جاتا ہے آگے اپنے فیل معنی کو محقق نکالیں۔

ہوائی سفر کے آرام پر سب کی نظر ہے لیکن اس کی قباحتوں اور صعوبتوں کو وہی جانتا ہے جو اس سے بار بار گزرے اور جسے اپنے اسباب کا وزن حد میں رکھنے کے لیے اسے بار بار کانٹے سے تولنا پڑے اور چیزوں کو پھینکنا پڑے۔ ہم تمام مسافروں کے مقابلہ میں دس کلو زیادہ لے جانے کا حق رکھتے ہیں کل تیس کلو یعنی چھیاسٹھ پاؤنڈ۔۔ لیکن لندن سے چلے تو سترہ کلو زیادہ تھے جس کے پیسے الگ دینے پڑے، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں کوئی چیز غیر ضروری ہوتی ہے ہم محتاط آدمی ہیں۔ کچھ وزن تو ہمارے ساتھ چورن اور ہاضمے کی گولیوں کا ہے، اتنا لمبا سفر ہے اس لیے ہم

نے خاصا ذخیرہ ساتھ رکھا ہے۔ ہیئر آئل کی بھی چند شیشیاں ہیں جانے کب ختم ہو جائے۔ پردیس میں کہاں ڈھونڈتے پھیریں گے کہ ہمیں روغن آملہ خاص الخاص یا باون جڑی بوٹیوں والا تیل چاہیے۔ کچھ پرانے رسالے نقوش اور فنون کے سالنامے اور بعضے ضخیم ناول اور تنقید کی کتابیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ تنہا آدمی کا جی گھبراتا ہے۔ مطالعے کے لیے ساتھ کُچھ نہ کُچھ رہنا ہی چاہیے۔ ایک سیٹ ہمارے ساتھ ہمارے دوست عبد العزیز خالد کی کتابوں کا بھی ہے جِن کی مدد سے ہم عربی سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں قاہرہ وغیرہ جانا ہے اور جامع ازہر کے شیخ سے گفتگو کرنی ہے۔ کچھ پرانے رسالے ہم نے لندن سے خریدے۔ پھر ہر شہر کے نقشے، گائیڈ بکس وغیرہ بھی ہیں۔ ہمارا جی تو انسائیکلوپیڈیا برٹینکا بھی ساتھ رکھنے کا تھا کیونکہ پردیس میں معلومات کی بڑی ضرورت رہتی ہے۔ لیکن اسی سامان کے بوجھ کی قدغن کی وجہ سے نہ لا سکے۔ ہماری بوجھ اُٹھانے کی صلاحیت بھی محدود ہے۔ کیونکہ منڈی میں اناج کی بوریاں ڈھونے کا کام ہم نے نہیں کیا۔ یورپ میں قُلی نہیں ملتے اور سوٹ کیس، گٹھڑیاں، پوٹلیاں، بریف کیس، تھیلے، اتنا کچھ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم گنتی تک بھول جاتے ہیں۔ یورپ والے کوئی چیز دیتے ہیں تو اس کا تھیلا اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ پورٹر کہیں مل گیا تو اس کا مُنہ

موتیوں سے بھرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بس نے فرینکفرٹ کے ہوائی اڈّے کے غلط دروازے پر اُتار دیا تھا۔ پورٹر نے صحیح دروازے تک پہنچایا۔ ہم نے چار روپے دے کر یہ جانا کہ خوش گیا۔ لیکن اس بندہ خدا نے تکرار کی کہ چھ روپے دو، اور لے کر ٹلا۔ اس پر اپنے قُلی یاد آئے۔ تین ٹرنک سر پر ہیں، آپ کے بستر کیس کو جس میں دو رضائیاں، کمبل، جوتے اور کرائے سے بچنے کے لیے نہ جانے کیا کیا آپ نے باندھ رکھا ہے، اپنے کاندھے میں حمائل کرتا ہے اور پھلوں کی ٹوکری ایک ہاتھ میں، تھیلا اور صراحی دوسرے میں، ناشتہ دان کہنی سے لٹکا ہوا۔ بوجھ سے لہراتا ہوا چلتا ہے۔ پُل پار کرتا ہے آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں اس کے بعد التجا کرتا ہے کہ اسے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بعضے نیک دل دوّنی چوّنی دے دیتے ہیں۔ بعضے ڈانٹتے ہیں قانون کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک آنہ فی نگ فی پھیرا کرایہ تھا۔ اِکنّی کی شکل بھی بنی رہتی تھی کہ کوئی زیادہ مانگے تو اسٹیشن ماسٹر کے پاس رپورٹ کی جائے۔ اب شاید دوّنی یا چوّنی کا ریٹ ہے۔ گاڑی چل دیتی ہے تو ہمارا یہ بھائی پاکستان کی روز افزوں ترقّی اور اقبال مندی کا حصّہ دار لال پگڑی سر کے نیچے رکھ پلیٹ فارم پر آرام کرنے کو لیٹ جاتا ہے اپنے روشن مستقبل کی ٹرین کے انتظار میں، جس کا سگنل نہیں گرتا، جو آنہیں پاتی۔
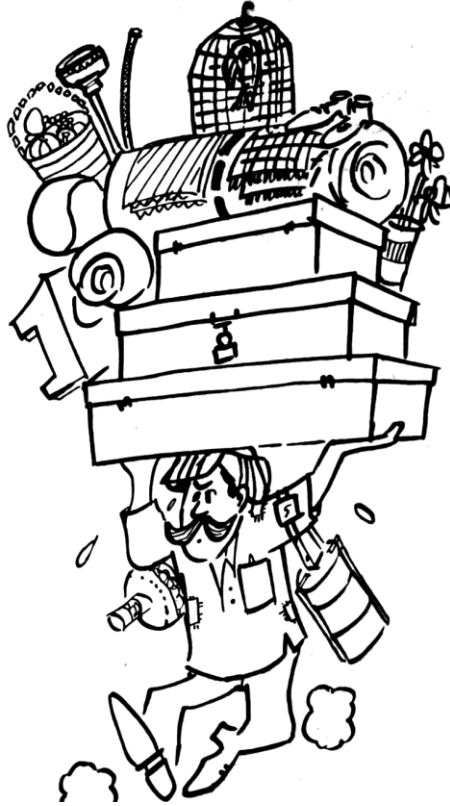
جب سے ہوائی کا سفر کا رواج ہے، لوگوں میں باہم محبّتیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ خلوص بھی رُخصت ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر پیٹی باندھے اکڑا بیٹھا ہے۔ یہ نہیں کہ پاس والے سے کلام کرے۔ اس کی خیریت پوچھے۔ ذات پات وطن دریافت کرے۔ مسائلِ حاضرہ پر چندے گفتگو ہو۔ کچھ آل اولاد کے کوائف دریافت ہوں۔ کتنے بچّے ہیں کیا کرتے ہیں، کتنوں کی شادی ہو چکی۔ جہیز میں کیا آیا۔ کشمیر

کب آزاد ہو گا۔ عرب کیسے جیت سکتے ہیں۔ سچّا مسلمان بننے کی کیوں ضرورت ہے۔ نئی نسل میں بے راہ روی اور بے شرمی کیوں پھیل رہی ہے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہوائی سفر میں آزادی بھی محدود ہے۔ آپ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چادر بچھا کر پوری برتھ پر پاؤں نہیں پسار سکتے جیسے ہم تھرڈ اور انٹر میں کرتے ہیں۔ نہ ٹرنک اور بُقچیاں پھیلا کر دوسرے مسافروں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ پھر ریل میں آپ کے پاس آموں کی ٹوکری ہے، مزے سے آم کھایئے اور اس کی گٹھلیاں فرش پر پھینکیے۔ کسی کی کیا مجال جو ٹوک سکے۔ اگر لمبا سفر ہے اور برانچ لائن ہے۔ آپ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ جانا ہے تو حقّہ بھی ساتھ رہنا چاہیے اور تمباکو اور اُپلوں کا تھیلا بھی۔۔۔ اُپلے نہیں تو گاڑی کے فرش پر کاغذوں سے آگ جلا لیجیے۔ دھوئیں کا کیا ہے کسی صورت باہر نکل جائے گا۔ جہاز کے سفر میں تو چڑھتے اترتے وقت "نو اسموکنگ" کا حکم رہتا ہے اور اس بے آرامی کے کھڑاگ کا نام کیا رکھا ہے۔۔۔ "ہوائی جہاز"

ہت تیری ہوائی جہاز بنانے والے کی

برلن۔۔۔ ہمارا اور منشی جی کا

ہم جن گائیڈ بکوں کی مدد سے بلادِ یورپ کا سفر کر رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو ۱۹۶۶ء کی چھپی ہوئی ہے جس کا نام ہے "یورپ میں پانچ ڈالر روز میں گزارا کیسے کیا جائے۔" اِس میں جگہ جگہ کے ہوٹلوں، سراؤں، ڈھابوں اور سستے ٹھکانوں کے پتے دیے گئے ہیں۔ یہ سال بھر پرانی ہے۔ اس لیے بہت سی باتیں غَلَط ہو گئی ہیں بلکہ ہمارے تو یہ کسی کام نہ آئی۔ استنبول میں ہمارے دوستوں نے ڈیڑھ ڈالر روز کا ہوٹل تلاش کر کے مصنّف کتاب کو زِک دی اور ولایت میں کہیں ہمارا گزارا آٹھ دس ڈالر سے کم میں نہیں ہوا۔ دوسری گائیڈ بُک کی بتائی ہوئی ہدایتیں بھی بہت دور از کار ہیں۔ اوّل تو اُس کا مصنّف ہلٹن ہوٹل سے کم میں کہیں ٹھہرا نہیں۔ دوسرے اُس کے سالِ طباعت ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک دنیا بدل گئی ہے۔ تیسری کتاب کے بتائے ہوئے اتے پتے البتّہ بہت جگہ صحیح نکلے۔ یہ اصل میں ایک سفر نامہ ہے۔۔۔

منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار

آج سے سڑسٹھ سال پہلے ۱۹۰۰ء کے سفر کا تصنیف لطیف منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ وزن اس ضخیم کتاب کا کوئی دو پاؤنڈ کے قریب ہو گا۔ ہوائی سفر میں ہر بار جو ہمیں زائد اسباب کا جرمانہ دینا پڑتا ہے وہ بڑی حد تک اِسی کتاب کے باعث ہے۔ برلن میں اس کتاب نے ہمیں بہت دوڑایا۔ ہم نے پوچھا فریڈرش سٹراس کہاں ہے تاکہ قیصر ہوٹل دیکھا جائے جہاں مولوی صاحب ٹھہرے تھے۔ بتانے والوں نے

بتایا کہ یہ سڑک تو مشرقی برلن میں ہے اور بہت طویل ہے۔ پہلے اس ہوٹل کا مکان نمبر تو معلوم ہو۔۔۔ پھر چاہے ہوٹل رہا ہے یا نہیں رہا ہے۔ کم از کم وہ پرانی عمارت یا جائے وقوع تو دیکھ لو گے۔ لہٰذا پہلی جستجو پرانی ڈائریکٹریوں کی ہوئی۔ یہ مغربی برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مل گئیں جہاں یہ لوگ ہمیں لاطینی زبان کے مخطوطے دکھانے لے گئے تھے۔ ۱۹۱۷ء کی ڈائریکٹری ہاتھ آئی۔ اس میں قیصر ہوف نامی ہوٹل کا پتہ درج تھا۔۔۔ کسی اور سڑک کا۔ ہم نے کہا۔۔۔ یہ نہ چاہیے۔۔۔ سب سے پرانی ڈائریکٹری اس ذخیرے میں ۱۸۷۰ء کی تھی۔ اس میں بھی دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر ہم نے کہا۔ بس اس سال کی دیکھنی چاہیے۔ ۱۹۰۰ء کی خوش قسمتی سے مل گئی اور اس میں پتہ بھی صحیح تھا۔ مکان نمبر بھی دیا تھا۔ ۱۷۸ مالک کا نام اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ نمبر ۷ ۶۳۔

دوسری چیز جس کی ہمیں تلاش تھی وہ برلن کے ایک پرانے اخبار "برلیز ٹاگ بلاٹ" یعنی "روزنامہ برلن" کا ایک پرانا پرچہ تھا۔ منشی جی نے برلن پہنچتے ہی پانچ چار اخباروں کے ایڈیٹروں کو ملاقات کے لیے خط لکھ دیئے تھے۔ قریب قریب سب کے جواب دوسرے روز مل گئے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ "برلینر ٹاگ بلاٹ جو یہاں کے اوّل درجے کا آزاد اور انٹرنیشنل اخبار سمجھا جاتا ہے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر لیوی سن نے

میرے خط کا جواب بذریعہ ''اورہ پوسٹ''یعنی دم کشی کی ڈاک سے اسی سہ پہر کو بھیج دیا تھا۔ یہ طریقہ خط بھیجنے کا بھی برلن میں عجیب ہے۔ جس خط کو شہر کے دوسرے حصّے میں بھیجنا مطلوب ہو، اس پر معمولی ڈاک سے دوچند محصول کا ٹکٹ چسپاں کیا جاتا ہے۔ یہ خط ایک نلکوں کے سلسلے کے اندر سے بذریعہ ہوا کے زور سے پہنچائے جاتے ہیں۔ یعنی نلکے میں خط ڈال کر پیچھے مشین کی ہوا سے دھکّا دیا اور دم زدن میں منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ جہاں سے تار کی طرح جلدی ہی تقسیم کر دیے گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں بھی یہ طریقہ ڈاک کا جاری ہو گیا ہے اور پیرس میں بھی۔

غرض چٹھّی پاتے ہی میں ۷ جولائی کو ۸ بجے شام کے مقرّرہ وقت پر ''برلیز ٹاگ بلاٹ'' کے دفتر میں پہنچا۔ ڈاکٹر لیوی سن اپنے کمرے سے باہر نکل کر مُجھے اندر اپنے ساتھ لے گیا۔۔۔ ہندو مسلمانوں کی آبادی اور گورنمنٹ سے رعایا کے تعلقات پر گفتگو ہوئی اور جب میں نے سمجھایا کہ کانگریس والے وہی خدمات سر انجام دینا چاہتے ہیں جو کسی زمانے میں فریق مقابل گورنمنٹ (اپوزیشن) ادا کرتا ہے تو اس کا ظن رفع ہوا کہ رعایا سرکار سے ناراض نہیں۔

میرے پاس پیسہ اخبار کا نمونہ موجود تھا۔ جرمن ایڈیٹر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کی قیمت کی ارزانی اور مقدارِ اشاعت دونوں باتوں کو پسند کیا بلکہ مجھ سے وہ

پرچہ لے لیا اور اپنے دوسرے روز کے اخبار میں میری ملاقات کی کیفیت معہ پیسہ اخبار کے ایک کالم کے فوٹو گراف کے چھاپ دی۔ ہم محقّق نہیں ہیں لیکن محقّقوں کے تلمیذِ رشید تو رہے ہیں اور گو کسی کالج یونیورسٹی میں آج کل نہیں پر واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ رجحان ہمارا اہلِ علم ہی کا سا ہے کہ ولی دکنی کے بیٹے کے ختنوں کی صحیح تاریخ معلوم ہونی چاہیے۔ خواہ اس کے لیے کسی کو پی ایچ ڈی کیوں نہ بنانا پڑے۔ پس ہم اس مسئلے سے پلچ گئے کہ یہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے اور اس کا فوٹو لے کر چھپوانا چاہیے تاکہ صاحبانِ تحقیق میں ہمارا نام لکھا جائے۔ سب سے پہلے تو ہم فرینکفرٹ یونیورسٹی میں گئے اور اس اخبار کا اتا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اس کا کوئی فائل فرینکفرٹ بھر میں نہیں ہے۔ پھر کولون اور بون میں جاتے ہی لائبریریوں کے پھیرے کیے۔ یہ متاع یہاں بھی نہ ملی۔ مغربی برلن پہنچتے ہی ہم نے میزبانوں سے کہا کہ ہاتھی نہیں چاہیے گھوڑا نہیں چاہیے۔ بس برلنر ٹاگ بلاٹ کا یہ پرچہ چاہیے۔ اس کے لیے ہم نے منادی کرائی، گماشتوں کو مختلف علاقوں کے کُتب خانوں میں دوڑایا لیکن خالی ہاتھ واپس آئے۔ ایک لائبریری یہاں کی مایہ ناز گنی جاتی ہے۔ ایک اونچی عمارت ہے، لاکھوں کتابیں ہیں۔ ہمیں اس کے کرتا دھرتا بڑے اَدَر کے ساتھ لے گئے تھے کہ ہم دیکھ کے تعریف کریں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے

لیکن اگر جولائی ۱۹۰۰ء کا "برلینر ٹاگ بلاٹ" تمہارے پاس نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

تب ہم نے کہا اب ہم مشرقی برلن جاتے ہیں۔

برلن میں کارگروں کے مجسمے

یہ ظالم ہمارے مغربی جرمنی کے میزبان ہمیں لوگوں سے ملانے اور لائبریریاں دکھانے میں اتنا مصروف رکھتے تھے کہ مشرقی برلن جانے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ آخر میں لائبریریوں سے ہم یہ کہہ کر بھاگے کہ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور

سیدھے سٹاڈبان کے اسٹیشن پر پہنچے۔ سٹاڈبان اے سادہ لوح قارئین کرام کسی جگہ یا چڑیا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص ریل کی سواری ہے۔ اس کے ڈبوں میں بھی کوئی سُرخاب کے پَر نہیں لگے تو پھر یہ کیا ہے؟ ہمیں برلن جانے سے پہلے ہی منشی محبوب عالم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ "شہر کے اندرونی حصّہ کے گرد اور عام طور پر شہر کے اندر ایک حلقہ ریل کا گزرتا ہے جس کی سڑک یک منزلہ مکانات کی چھتوں کے برابر یا بیس فٹ بلند ہے اور اس سڑک کے نیچے ٦٦ پل شہر کے اندر ہیں جرمن اس کو سٹاڈبان یعنی شہر کی ریل کہتے ہیں۔ اس کے اسٹیشن دو دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ گاڑی ہر پانچ منٹ کے بعد ہر اسٹیشن سے دونوں طرف روانہ ہوتی ہے اور نصف منٹ سے زیادہ کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی اس ریل کو پرنس بسمارک نے تجویز کیا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لیے کوئی شخص نوکر نہیں البتّہ چند مشینیں لیٹر بکسوں کی طرح کھڑی ہیں جب کوئی ان میں فینی کا سِکّہ ڈالتا ہے۔ جھٹ ایک ٹکٹ تیسرے درجے کا ان کے ایک منہ سے گر پڑتا ہے۔"

سر سٹھ سال میں اگر اس معمول میں کوئی فرق ہوا تو یہ کہ اب ریل پانچ کی بجائے ہر پندرہ منٹ بعد چھوٹنے لگی ہے اور ٹکٹ دینے کا سلسلہ آٹومیٹک نہیں رہا بلکہ آدمی کھڑکی میں بیٹھا پیسے لیتا ہے ٹکٹ دیتا ہے۔ آٹومیٹک سلسلہ ہم نے فقط مشرقی برلن کی

بسوں میں دیکھا۔ اس فرق سے قطع نظر پل وہی راستے وہی ہیں۔ اسٹیشن وہی ہیں اور شاید کچھ گاڑیاں بھی وہی ہیں۔ جن میں ہمارے منشی صاحب بیٹھتے رہے ہیں۔ ہم بھی بیٹھ کر اترے تو مشرقی برلن میں اسی اسٹیشن پر اترے جہاں سے منشی صاحب چڑھتے اُترتے ہوں گے۔ فریڈرش سٹر اس کا اسٹیشن۔ سٹر اس کا مطلب روڈ ہے۔ ہر سڑک کا نام اس پر تمام ہوتا ہے۔ مشرقی برلن کا کسٹم والا ہمارے تھیلے کے کاغذوں کتابوں کی پڑتال میں کچھ زیادہ ہی دیر لگا رہا تھا بلکہ ہمارا ایک آرٹیکل ایک جرمن رسالے میں چھپا ہے وہ بھی شومئ قسمت سے بستے میں تھا۔ اس کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہم نے کہا اے بھیّا۔ چھوڑ اسے۔ اپنے پاس رکھ لے اور ہمیں اسٹیٹ لائبریری کا پتہ بتا۔ اس پر وہ بھلا مانس چونکا اور کہا۔ جاؤ فریڈرش سٹر اس سے انٹر ڈن لینڈن بائیں ہاتھ مڑو۔ تھوڑی دور بعد بائیں ہاتھ کو اسٹیٹ لائبریری ہے۔۔۔ 'اسٹاٹ نبلیو تھک' آٹھ بجے تک کھلی رہے گی۔"

ہم نے مشرقی برلن کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور دُکانوں کا مطالعہ آئندہ پر چھوڑا اور لائبریری کا رُخ کیا۔ بڑی پُر شکوہ عمارت ہے۔ چوڑے پاٹ کی سنگین اور بلند و بالا، جنگ میں ایک حصّہ تباہ ہو گیا تھا لیکن زیادہ تر بچ رہی۔ کتنی ہی سیڑھیاں چڑھنے اور غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد رسالوں اور اخباروں کا شعبہ آیا۔

بہت سے لوگ سر جھکائے پڑھ رہے تھے۔ فائل مختلف میزوں پر پڑے تھے۔ ایک بی بی لائبریرین سر جھکائے اپنا کام کر رہی تھیں۔ ہم نے عرض مطلب کیا کہ ہم برلینز ٹاگ بلاٹ کی تلاش میں آہنی پردے کے پیچھے آئے ہیں۔ ہمارا سوال پورا ہونا چاہیے۔

یہ محترمہ بہت کم انگریزی جانتی تھیں۔ اٹک اٹک کر بولتی تھیں۔ فرمایا: ”مل تو جائے گا لیکن کل جو صاحبہ انچارج ہیں وہ موجود نہیں، پانچ بجے چھٹی کر جاتی ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم عمر میں پہلی بار برلن آئے ہیں اور آج جا کر شاید نہ لوٹ سکیں۔ کچھ کرو کامریڈ ہمارے لیے۔“ بے چاری بہت اچھی تھیں۔ ہم نے بات میں زور پیدا کرنے کے لیے کہا۔ ”ہمارے دادا یہاں آئے تھے۔ ان کا ذکر اور ان کے اخبار کا فوٹو اس میں چھپا ہے (ہمارے نہ سہی ہمارے دوست حبیب عالم کے دادا تو تھے) رشتے کے حوالے سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور بے چاری نے ایک لمبا فون کیا اور پھر خود اُٹھ کر گئیں۔ آدھے گھنٹے میں ایک فائل نکال کر لائیں اور جولائی ۱۹۰۰ء کا برلینز ٹاگ بلاٹ ہمارے سامنے تھا۔

ہمارے منشی جی ۷ جولائی کو اس کے ایڈیٹر سے ملے تھے اور ان کے بیان کے مطابق

دوسرے دِن کے پرچے میں پیسہ اخبار کا فوٹو چھپا تھا۔ ہم نے ۸ جولائی کا پرچہ نکالا۔ اس میں کچھ نہ پایا تو ۹ جولائی میں جھانکا کہ شاید، پھر دس جولائی، گیارہ جولائی، بارہ جولائی، تیرہ جولائی، چودہ جولائی۔۔۔ آخر مایوس ہو کر فائل بند کر دیا محنت اکارت گئی۔ پیسہ اخبار کا عکس کہیں نظر نہ آیا۔ جی میں طرح طرح کے وسوسے آئے۔ منشی جی نے یونہی تو نہیں اڑا دی تھی۔ احتیاطاً ہم نے سات کا پرچہ بھی دیکھ ڈالا۔ آٹھ، نو، دس کا ایک ایک کالم بہ نظر غائر پھر دیکھا۔ یہ تراشا ہمیں نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر اس بی بی سے ہم نے کہا۔ ابھی اخبار لوٹایئے نہیں۔ کل ہمیں وقت ملا تو پھر آئیں گے۔

دِل میں عجب دُبدھا سا تھا۔ سفر نامہ آکر دوبارہ پڑھا۔ اس میں وہی دوسرے دِن کا حوالہ تھا۔ تیرہ کو تو منشی جی برلن سے چلے ہی گئے تھے۔ انہیں دھوکہ ہوا کیا؟

اگلے روز دیکھنا تو ہمیں ہسٹری کا میوزیم بھی تھا کیونکہ پہلے روز لائبریری میں اتنا وقت لگا کہ میوزیم بند ہو رہا تھا لیکن قدم کشاں کشاں لائبریری ہی میں لے گئے۔ اب ہم نے سوچا کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے مہینے کا پرچہ دیکھیں گے۔ چودہ کے بعد پندرہ جولائی کے شمارے کے آٹھ صفحے الٹے تھے کہ نویں صفحہ پر پیسہ اخبار اور اُردُو تحریر نظر آئی۔ ہم نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔ منشی صاحب کے متعلّق جو ذرا سی بد گمانی ہوئی تھی۔ اس پر افسوس بھی ہوا۔ یہ عکس "پیسہ اخبار" یوم شنبہ ۱۴

اپریل ۱۹۰۰ء کے ادارتی کالم کا تھا۔ سرخی تھی۔

”تعلیم اسلام حکومت انگریزی کی کیسی موید ہے۔“

سُرخی کے نیچے ایڈیٹر کا نوٹ:

”حال ہی میں دو یورپین افسروں کے ایک جاہل سرحدی آدمی کے ہاتھ سے بلا وجہ قتل کیے جانے پر جو رائے میں پیسہ اخبار میں ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسی شقاوت اور سفاہت کی کارروائی کسی طرح بھی باعثِ ثواب نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی سچّا مذہب اس کو روا رکھ سکتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک ضروری سرحدی اسٹیشن کے تمام معزّز طبقہ کے مسلمانوں کی رائے مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ میں ان کالموں میں اسے نمایاں جگہ دیتا ہوں“۔۔۔(ایڈیٹر)

اس کے نیچے کی تحریر کس کے قلم سے ہے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ کالم کا اختتام ایک نامکمل فقرے پر ہوتا ہے۔

رائیٹ برادران سے رجب علی سرور تک

یورپ والوں کی خوبیاں اپنی جگہ لیکن یہ لوگ ہیں کم سواد۔ ہو سکتا ہے ہم غلط لوگوں سے ملتے رہے ہوں۔ بہر حال ذاتی تجربہ یہی ہے کہ ہر چند ہم نے بات سے بات نکال کر جتایا کہ ہم شاعر ہیں۔ کسی نے خاص اعتنا نہ کی۔ ہمارا دیوان جیسا بستے میں ہم نے باندھا تھا ویسا بندھا ہے۔ ایک صاحب سے تعارف ہوا کہ یہ بھی مصنّف ہیں۔ ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟ شاعری؟ ناول؟ بولے جی نہیں۔ میرا مضمون الیکٹرونکس ہے۔ ہم پوچھنے کو تھے کہ الیکٹرونکس کیا ہوتی ہے؟ لیکن ازراہِ مصلحت باز رہے۔ ایک ادارہ کتابیں تیّار کر رہا ہے جو پاکستان بھی آئیں گی، ہم بھاگے بھاگے وہاں گئے۔ معلوم ہوا دھاتوں پر کیمیاوی اثرات، ویلڈنگ، خراد اور آئل ٹیکنالوجی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ہم نے بہت کرید کی کہ علم بدیع و معانی کی کوئی کتاب بھی شاید ہو اور صنعتوں ہی پر زور ہے تو صنعت توشیح، مراعات النظیر، بے نقط

وغیرہ کئی صنعتیں ہم نے ایم اے میں پڑھی تھیں، اُن پر کچھ کام ہونا چاہیے۔ جیسا ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ ایک صاحب نے کتاب لکھی جس کی ہر سطر اور ہر لفظ سے تاریخ نکلتی ہے۔ سنِ ہجری یا سالِ عیسوی بر آمد ہوتا ہے لیکن سہیات۔ یورپ والوں نے صنعت کے لفظ کے معنی ہی بدل دیے ہیں۔ کہاں تو یہ شریف اصطلاح زبان و بیان کی باریکیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، یا اب لوہے فولاد کیمیاوی کھاد تیل وغیرہ کے کارخانے صنعتیں کہلانے لگے ہیں۔

کچھ دِنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت و حُرفت وغیرہ کی باتیں سُنتے رہے لیکن ایک دِن ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم نے کہا یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس خصوص میں بہت کام کیا ہے۔ میڈیکل سائنس میں ایسی دستگاہ تھی کہ ایک ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بد ہضمی کو فوراً تشخیص کر دی کہ تم نے تربوز بہت کھایا ہے۔ محض عقل اور قیافے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر مریض کے اِرد گرد تربوز کے چھلکے بکھرے تھے۔ اسٹرانومی یعنی علمِ ہیئت میں اب بے شک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں کیونکہ ہم میدان میں نہیں ہیں۔ ہماری توجّہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے ورنہ ہمارے مدرسوں میں درسِ نظامیہ میں علمِ ہیئت بھی

پڑھاتے تھے۔

ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی، بولے یہ علم ہیئت کپلر اور کوپر نیکس وغیرہ والا۔ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا۔ یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں ہمارے حکما نے اس سے صدیوں پہلے ستاروں اور سیّاروں وغیرہ کا سُراغ لگا لیا تھا۔ بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں، یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتار زمانہ پر اور لوگوں کی قسمتوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں اب بھی بے شمار تصانیف از قسم جنتریاں موجود ہیں بلکہ بعضے ادارے تو سال کے سال نئی جنتریاں چھاپتے ہیں جس میں برج حمل، برج عقرب وغیرہ کے سعد و نجس کے ساتھ ساتھ خوابوں کی تعبیریں، فال نامے وغیرہ درج رہتے ہیں۔ جا بجا زائچے بھی دیے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان میں صابن سازی، اور بوٹ پالش بنانے اور پاؤنڈ کریم اور قدرتی رنگ کا خضاب وغیرہ تیّار کرنے کے نسخے بھی دیے ہوتے ہیں جس سے اس گمان کی ایک حد تک تردید ہو جانی چاہیے کہ ہماری توجّہ صنعتوں کی طرف نہیں ہے اور ہم محض خیالی باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں سے پرانی وضع کے جو لوگ یورپ جاتے رہے ہیں بس جاتے تھے اور پھِر پھرا کے خالی ہاتھ آ جاتے تھے۔ ٹرانزسٹر، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کچھ

ساتھ نہ لاتے تھے۔

اس کی توجیہہ تو کوئی کرنا چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں کیونکہ اور کچھ ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں تاویل کرنا خوب جانتے ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بس کتابیں اور سفر نامے وغیرہ لکھتے تھے۔ سر سیّد احمد خاں گئے۔ کچھ تو اسلام کا مقدمہ لڑتے رہے میورؔ کی کتاب کے جواب فراہم کرتے رہے۔ مسلمانوں کے متعلّق انگریزوں کی بدگمانیاں دور کرتے رہے اور واپس آئے تو سائنٹیفک سوسائٹی کی داغ بیل ڈال ترجمے شروع کر دیے۔ وہ تو اس زمانے کے مولوی ذرا مُستعد تھے ان کی نیچریت اور کفر وغیرہ کو فوراً پکڑ لیا ورنہ سیّد صاحب جانے کہاں تک جاتے۔ شیخ عبدالقادر گئے تو اقبال کو خط لکھ مارا کہ

کام جو کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے اور مخزن میں ایک مضمون بھی لمبا چوڑا لکھا کہ "گھر سے نکل کے دیکھو۔۔۔ہندوستان والو۔" ہر پھر کے پھر ذکر مولوی محبوب عالم کا آتا ہے کہ اچھے خاصے پرانی وضع کے آدمی تھے۔ داڑھی تو بے شک یورپ جا کر نہ منڈوائی اور گوشت کھانے میں بھی احتیاط کرتے رہے۔ فقط یہودیوں کی دُکانوں سے تو شرعی حلال کھانے یا سبزیاں واپس کھاتے رہے اور ہماری طرح ٹھنڈا پانی پیتے رہے لیکن ویسے مغرب کی ترقّی سے اُن کی آنکھیں چوندھیا

گئیں۔ اپنے ۱۹۰۰ء کے سفر نامے میں برلن کے ٹیکنیکل ہائی اسکول کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے بھی جا کر یہ اسکول دیکھا۔ اگرچہ یہ یونیورسٹی بن گیا ہے لیکن عمارت وہی پرانی ہے جو مولوی محبوب عالم نے دیکھی تھی۔ ذرا ان کا بیان سنیئے کیسے لٹّو ہوئے ان لوگوں پر کہ ہمارے کلاسیکل طرزِ تعلیم تک کی برائی کر دی۔

"جس چیز نے جرمنی کو بڑی شہرت اور عزّت دی ہے وہ یہاں کا پالی ٹکنی گم یعنی ٹیکنیکل ہائی اسکول ہے۔ یہ مدرسہ ایک سو ایک سال سے جاری ہے۔ میں ساڑھے پانچ گھنٹے برابر اس عالی شان تعلیم گاہ کی مختلف منزلوں اور درجوں کا طواف کرتا رہا۔ آدھا بھی نہ دیکھ سکا۔ آرگینک اور ان آرگینک کیمسٹری کے تجربے دیکھے۔ آج کل یورپ کے تین ہزار طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ سوائے ترکی کے یورپ کے ہر ملک کے طالبِ علم یہاں ہیں۔ ایک عجائب خانہ میں ہر قسم کی مشین کا چھوٹا سا نمونہ طالبِ علموں کے سمجھانے کے لیے رکھا ہے۔ لیکن ایک دوسری جگہ ایک مکان میں مشینوں کے ہر پرزہ کے مختلف عمل اس کے مختلف حصّوں سے دِکھائے گئے ہیں۔ عمارات اور پُلوں کے ماڈل۔ دُخانی جہازوں کے نمونے نقشہ کشی، بخاری، علمِ رنگ کے لیکچر کے کمرے اور خُدا جانے اور کتنے کمرے اور لیکچر روم۔ جرمنوں کا یہ کہنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ اتنا بڑا مدرسہ اس فن کا دنیا میں کوئی دوسرا

نہیں۔ مسلمان بڑے ناز سے اب تک یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں ایک وقت میں دس ہزار طالب علم پڑھتے ہیں اور مراکو کے فیض کے دار العلوم میں بھی کئی ہزار طالب علم پڑھتے ہیں مگر بھلے آدمیو دیکھو تو سہی وہ کیا پڑھتے ہیں اور یہ کیا پڑھتے ہیں۔ جن علوم کو الازہر اور فیض میں پڑھایا جاتا ہے وہ اب بوسیدہ ہڈّیاں ہو چکی ہیں۔ کوئی مینبدی پڑھنے والے کو ذرا امریکہ کی مشہور بک یونیورسٹی کی رصد گاہ میں یا گرینچ (انگلستان) کی رصد گاہ میں لے جا کر مُقابلہ تو کرے کہ وہ فرضی علم ہیئت صحیح ہے یا یہ عینی مشاہدہ ستاروں کا عظیم الشّان دور بینوں سے۔ جو لوگ اس قسم کے مُقابلوں کو پسند نہیں کرتے وہ مُجھے معاف کریں۔

تو و طوبیٰ و ماو قامت یار

فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست

آگے چل کر مولوی محبوب عالم دردمندی سے لکھتے ہیں:

"اس ٹیکنیکل اس کول کے معائنہ کے دوران میں اس کی عظمت اور سامان کو دیکھ کر مُجھے اپنا آپ نہایت حقیر معلوم ہوتا تھا اور مایوسی ہمّت کو ایسا پست کر رہی تھی کہ دِل میں خیال گزرتا تھا کہ اس قسم کی زندگی کا تو خودکُشی سے خاتمہ کر دینا چاہیے جو ایسی

ناکارہ ہے۔ یہ ایک ایسے سلسلۂ خیالات کا نتیجہ تھا کہ جس کے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تو روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایسی تعلیم گاہ ابھی دو صدیوں تک قائم نہیں ہو گی۔" سچ پوچھیے تو آج کل ہمارا ایمان بھی ڈانوا ڈول ہو رہا ہے کچھ دِن پہلے تک ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سچّے مسلمان بننے کے علاوہ بھی بہت کُچھ کرنا پڑے گا۔ قوم کو صنعتی تعلیم دینی ہو گی کارخانے بنانے ہوں گے اجتماعی فارموں میں ٹریکٹروں اور مشینوں سے کاشت کر کے پیداوار بڑھانی پڑے گی تاکہ ملک کی معیشت مستحکم ہو۔ سب اچھا کھائیں، پئیں، ٹیلی وژن جناب شیخ ہی کے گھر میں کیوں ہو، مُریدِ سادہ کے گھر میں کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ جو آج پڑھ لکھ کر کلرک اور چپراسی کی نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کل مکینک اور خرادیے ہوں گے تو اپنی خودی کو بھی بُلند کر سکیں گے۔ میرے آپ کے محتاج نہیں ہوں گے۔ جب آپ کے کھیت آباد کارخانے رواں، خزانے بھرپور اور لوگ خوش باش ہوں گے پھر کیا مجال ہے جو کوئی ہمسایہ یا غیر ہمسایہ ٹیڑھی نظر سے آپ کو دیکھ سکے۔ اس وقت سچّے مسلمان بننے کا مزہ بھی زیادہ ہو گا۔ اس وقت تو

شب جو عقد نماز بربندم

چہ خورد بامداد فرزمرم

صاحبو! اوروں کی کیا کہیں ہم نے بھی ساری عمر شاعری ہی کی۔ دوسروں کی شاعری پر واہ واہ اور مکرّر ارشاد میں عمر گزار دی۔ کیا کریں ہماری تعلیم ہی سوداؔ اور میرؔ کے کلام سے شروع ہوئی۔ چھٹی جماعت کے اُردو کورس میں میرؔ تھے، خواجہ میر درد تھے، آتشؔ تھے، سوز و گداز تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے کہ ماسٹر گوردیال سنگھ تھوڑی سائنس بھی پڑھا دیتے تھے جس سے کُچھ تصوّر ایصالِ حرارت اور قوّتِ انابیب شعری اور حیاتین وغیرہ کا اب تک ہے اور یہ معلوم ہے کہ فارن ہائیٹ کیا ہوتا ہے۔ مکتب میں پڑھے ہوتے تو۔۔۔ جھوم جھوم کر پڑھنا، شام کو روٹیاں مانگ کر لانا، چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر لڑنا، مین میکھ نکالنا اور اس بات سے غافل رہنا کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے، فضا میں کیا ہو رہا ہے، خلا میں کیا ہو رہا ہے، علم الکلام کے رموز تو استاد نے پڑھا دیئے۔ جابر بن حیان کا نام نہ بتایا۔

جب کپلر اور گلیلیو آسمان میں تھگلی لگا رہے تھے۔۔۔ ہم شاعری کر رہے تھے۔

جب واٹ اور اسٹیفن بھاپ کو غلام بنا رہے تھے۔۔۔ شاہ نصیر دہلوی کی کوشش تھی کہ کوئی قافیہ بندھنے سے نہ رہ جائے۔

جب ایڈیسن اور مارکونی برق اور آواز کے دیوؤں کو اسیر کر رہے تھے۔۔۔ ہم

شعری گلدستے فتنہ اور عطرِ فتنہ نکال رہے تھے۔

جب رائٹ برادران کلوں سے ہوا میں اڑ رہے تھے۔۔۔ ہم اور رجب علی بیگ سرور لفظوں کے طوطے مینا بنا رہے تھے۔ ہر مصرع سے تاریخ نکال رہے تھے۔

اور جب امریکہ اور روس نے آسمان کے لیے نئے چاند ستارے بنا لیے ہم پرانے اختر شناس اب بھی جنتریوں اور فال ناموں میں اپنی قسمت کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی ہمارے ہوٹلوں کے بالا خانے عطائی، معالجوں، ہڑڑپوپوں سے آباد ہیں۔ عباسیوں کے عہد کو کتنی صدیاں ہوئیں۔ جاگو اور دیکھو کہ اب کس بادشاہ کی بادشاہی ہے، بیچ میں قصیدہ گو، واسوخت گو، قافیہ پیما، منشی احمد حسین قمر اور منشی محمد حسین جاہ تو ضرور ملیں گے، لیکن مسلمانوں میں کوئی کوپرنیکس، واٹ، ایڈیسن اور مارکونی نہ ملے گا۔ جس نے کی شاعری کی، مشاعرہ برپا کیا، گلدستۂ سُخن نکالا، یا پھر نئے فرقے پیدا کیے، مقلّد و غیر مقلّد کی بحثیں چلیں، آمین بالجہر پر فساد ہوتے، ذبیحہ اور رویتِ ہلال پر آکر سفینہ کنارے لگا۔

ایمسٹرڈم میں اور برلن میں ایسے ڈپارٹمنٹل اسٹور دیکھے کہ پوری منزل کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گُڈّے بھی ہیں۔ لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے

جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گیئر کیسے کام کرتے ہیں، ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔۔۔یہی التزام یہاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔

یارو۔۔۔کیا ہیں یہ قصّے جن کو سینے سے لگائے پھرتے ہو۔۔۔فارس کے شہزادوں کی کہانیاں ہیں۔ جانِ عالم اور بدر منیر کو کب تک روؤ گے۔ میرؔ کی

بے زری کا نہ کر گلہ غافل

رکھ تسلّی کہ یوں مقدّر تھا

کب تک ہماری نئی نسل کے کورسوں میں رہے گی۔ سکندر تو جب دنیا سے گیا تب خالی ہاتھ تھا۔ تم تو دنیا میں خالی ہاتھ ہو۔ غالبؔ جیسے بھی ہستی کے فریب میں نہیں آئے۔ عالم کو حلقۂ دام خیال جانتے ہیں اور ہم نے دنیا بھر کے علوم اِس شاعر کے دیوان میں ڈھونڈ لیے۔ جیسے آریہ سماجی لوگ جیٹ ہوائی جہازوں کو دیدوں میں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

اے صاحبو! دِن بھر مصاحبوں کے جلو میں بیٹھے ناؤنوش کرنے والے، مُجرا دیکھنے والے اور مشاعرے کرانے والے، کُچھ عُذر کے ساتھ، کچھ پچھلی صدی کے ساتھ

گئے۔ کچھ پہلی جنگ میں فنا ہوئے کچھ دوسری جنگ کے ساتھ ختم ہوئے اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد تو اُن کی ایک یاد سی باقی ہے۔ سو وہ بھی کیا ہے اچھا ہے یہ لوگ ختم ہوئے۔ اچھا ہے ہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہار گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوتے جو ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے تاثرات اس وقت رقم کیے جب برطانوی راج کا آفتاب نصب النّہار پر تھا۔ آزادی کا تصوّر بھی نہ تھا۔ اُن کو دو سو سال تک کچھ ہوتا نظر نہ آیا۔ ہم اتنے مایوس نہیں۔ دست و بازو بھی مضبوط رکھتے ہیں۔ موقع ملے تو ذہن کی جودت میں بھی کم نہیں۔ اک ذرا یہ شاعری اور قناعت اور سوز و گداز اور وحدت الوجود اور مراعاۃ النظیر اور رویتِ ہلال وغیرہ کے مباحث نہ ہوں تو۔۔۔!

ہالینڈ

۲۷ اکتوبر تا ۵ نومبر ۱۹۶۷ء

HOTEL ALBERS
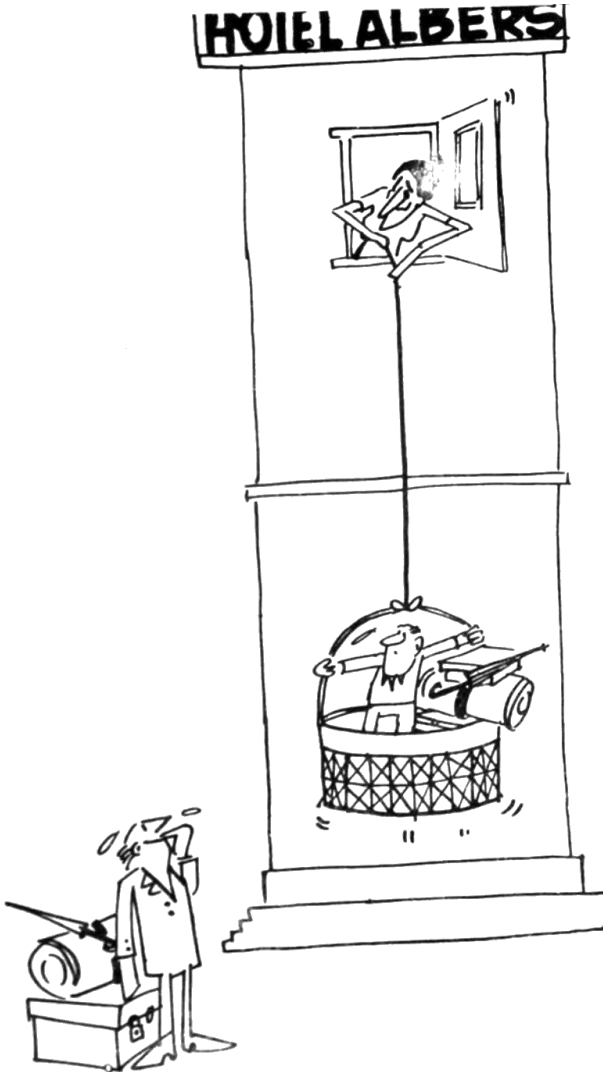
کوہ (ہوٹل) البرز کی چوٹی پر

از ایمسٹرڈم

بخدمت جناب مُعلّٰی القاب قدرت اللہ شہاب، سابق سفیر متعینہ ہالینڈ، خیریت موجود خیریت مطلوب!

جنابِ والا! کیا یہی ایمسٹرڈم ہے جہاں ریمبراں وغیرہ پیدا ہوئے تھے؟ ان لوگوں کو کوئی اور جگہ پیدا ہونے کو نہ ملی جس بھٹیار خانے میں بستر پر اکڑوں بیٹھے ہم یہ سطور رقم کر رہے ہیں اس سے تو کراچی کے ٹرام پٹے والے ہوٹل ہزار درجہ اچھے جن میں مجرّب سنیاسی نسخوں والے حکیم اور قسمت کا کچّا چٹھّا بتانے اور تقدیر بگاڑنے بنانے والے عامل کامل رہتے ہیں۔ وہ پروفیسر جِن کے کمروں کے باہر لال آنکھوں اور سینگوں والے خوفناک جِنوں، کھوپڑیوں اور سفلی جانوروں کی تصویروں کے پھٹے

لگے رہتے ہیں۔ ہم سیدھے مغربی برلن سے آئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹوکیو سے میر پور خاص کی گلیوں میں پہنچ گئے ہوں۔ وہاں کی سڑکیں ایسی صاف اور مُجلّا کہ ہم تو آئینہ دیکھتے ہی نہیں تھے۔ بس سڑک میں اپنا منہ دیکھ لیتے تھے۔ انتظام ہمارا ایک ایسے شاندار ہوٹل میں تھا جس کے باہر شاندار وردیوں والے چوب دار بکلوس باندھے کھڑے رہتے تھے۔ بڑھ کر دروازہ کھولتے۔ بات بات پر اور بعض اوقات بلا بات کے بھی سلیوٹ کرتے۔ ہمارا سوٹ کیس اور ہمارے ناز اُٹھاتے، تعظیم بجا لاتے۔ ایسی ٹھاٹ کے چاوش تھے کہ ہمارا خود انہیں سلام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کمرہ قالین والا۔ مکلّف۔ ایک طرف کو صوفہ پڑا ہے، کمرے کے ساتھ ہی اپنا ذاتی غسل خانہ، چاہے صُبح سے شام تک اس کے اندر بیٹھے اخبار پڑھتے رہو۔ چاہے بے ثباتی دنیا پر غور کرتے رہو۔ کوئی بے جا مداخلت کرنے والا نہیں کیونکہ کمرے کے باہر تختی لٹکا سکتے ہیں Don't Disturb یعنی خبردار اگر کوئی اندر آیا۔ دروازہ ایسا کہ ذرا سا کواڑ آپ نے بھیڑا اور خود بخود تالہ لگ گیا۔ یہاں کے دروازے کی طرح نہیں کہ اتنی بڑی چابی سے بھی آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ لِفٹ موجود ہے۔

چھٹّی منزل پر نہایت جھلمل جھلمل کرتا ناشتے کا کمرہ، بیرے سفید بُراق یونیفارم زیب تن کیے ہوئے (جیسی ہمیں کبھی نصیب نہ ہوئی) بات بات پر بلائیں لے رہے

ہیں۔ یس سر، یس سر کر رہے ہیں۔ یہ بڑا اشاندار لاؤنج جس میں ہم اپنی ترجمان مس فرانسسکا کو بٹھاتے تھے۔ یہ بی بی فرانسسکا ہمارے یہاں کے میز بانوں نے ہمارے ساتھ لگادی تھی۔ کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ ہمیں ہوائی اڈّے پر لینے آئی۔ چھوڑنے آئی۔ ہمہ وقت ساتھ رہی ٹیکسی کا کرایہ بھی ہمارے میز بانوں کے حساب میں خود دیتی تھی۔ البتّہ اس کو دوپہر کا کھانا ہم اپنے پلّے سے کھلاتے تھے۔ خیر اس کا ملال نہیں کیونکہ ہم تو اس کا روٹی کپڑے پاندان وغیرہ کا پورا خرچ اُٹھانے کو بھی تیّار ہو جاتے۔ ویسے اس کو لنچ کھلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ برلن سے رخصتی کے وقت ہوٹل کا بل دینے کے بعد ہمارے پاس بیروں کی فوج ظفر موج کو بخششیں دینے اور ائیرپورٹ ٹیکس ادا کرنے تک کا پیسہ نہ تھا۔ ہم نے وہ دو تین پاؤنڈ تڑوائے جو لندن والے الاؤنس میں سے آلو مٹر کھا کھا کر اور پیدل چل چل کر بچائے تھے۔ کرایہ برلن والے ہوٹل کا کچھ زیادہ نہ تھا۔ سولہ مارک روزانہ تھا۔ یعنی چار ڈالر، اور یاد رہے کہ غسل خانے سمیت جس میں خوشبودار صابن کی ٹکیہ اور چار تولیے، ہر روز بدلے جاتے تھے۔ ساڑھے تین مارک کا ناشتہ، ویسے ہم رئیس ابن رئیس ایک انڈا بھی ساتھ کھاتے تھے، جس کے کچھ پیسے مزید ہوتے تھے۔ اس پر پندرہ فیصدی سروس چارج۔ باوجود اس ٹھاٹھ باٹھ کے ہمارے روزینے میں سے جو ۴۵ مارک تھا

ہمارے کھانے (اور کھلانے) اور مشرقی برلن دیکھنے کے لیے کوئی بیس مارک رہ جاتے تھے۔ یہاں ہماراروزینہ بتیس گلڈر، ہوٹل سولہ گلڈر، پندرہ فی صدی اس کے علاوہ۔ کھانے کی ابھی نوبت نہیں آئی بس رات بسکٹ کھا کر پانی پی لیا تھا۔ یہی لیل و نہار رہے تو یہاں بسکٹوں اور سینڈوچ وغیرہ پر گزر ہو گی کھانا کھانے کی نوبت اگلی منزل پر ہی آئے گی۔

اس ہوٹل کا انتظام ہماری ایئر لائن والوں نے (ہمارے خرچ پر) کیا تھا۔ ایئر ٹرمینل سے کوئی آدھی فرلانگ دور تھا لیکن ٹیکسی والے نے کہا جی ڈھائی گلڈر (ایک پاؤنڈ میں دس گلڈر سے کچھ کم ہوتے ہیں) ہو گئے۔ کراچی میں اتنے فاصلے کے پچاس پیسے ہوتے ہمارے پاس خوردہ نہیں تھا۔ ہم نے تین دیے اس نے جھٹ جیب میں ڈال لیے اور فرمایا Is it OK? یعنی آدھا گلڈر بخشش تم کافی سمجھتے ہو یا اور دو گے؟ اس سے بھگت کر اور سڑک سے خود ہی سوٹ کیس اٹھا کر اس دروازے پر پہنچے جس پر چھوٹی سی تختی البرز ہوٹل کی لگی تھی۔ تو ہمارے گھنٹی بجانے پر اندر کھٹکا سا ہوا اور دروازہ کھُل گیا۔ ہمارے ہوش ہوا ہو گئے۔ کیونکہ اندر کمرہ یا لاؤنج یا دفتر نہیں تھا بلکہ سیڑھیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ حدِّ نظر تک چلا گیا تھا اور تقریباً عمودی سلسلہ نوّے کا نہیں تو ۸۵ درجہ کا ضرور بنتا ہو گا۔ عرض سیڑھی کا تقریباً ۴ انچ پاؤں کی اگلی

انگلیاں رکھ کر چڑھو، پورا پیر رکھنے کی گنجائش نہیں۔ ہم لوٹنے کو تھے کہ اوپر اس کوئیں کی منڈیر پر سے آواز آئی۔ ”گڈ آفٹر نون۔ دروازہ بند کر دینا۔“ یہ وہ بڑھیا تھیں جو اس کی مالک، بیرا، خانساماں، جھاڑو بہارو والی غرضیکہ سب کچھ تھیں۔۔۔ دروازے کی چٹخنی کے ساتھ انہوں نے ادوائن کی ایک رسّی باندھ رکھی تھی جو دیوار کے ساتھ ساتھ کنڈیوں میں سے ہوتی ہوئی اوپر ان کے کمرے تک چلی گئی تھی۔ قسمت کا مارا مسافر باہر سے گھنٹی بجاتا ہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے اس رسّی کو ایک زور کا جھٹکا دیتی ہیں اور دروازہ کھٹ سے کھُل جاتا ہے پھر تاکید کرتی ہیں کہ بند کر کے آنا۔ ہمارے کمرے تک آنے کے لیے ۵۷ سیڑھیاں پڑتی ہیں۔ ہوٹل البرز سے شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ یہ البرز کسی کا نام ہو گا۔ کوہِ البرز کی نسبت کی طرف دھیان نہ گیا تھا۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ اور دوسری حاجات ضروریہ وغیر ضروریہ کا کیا سوال؟ اس سردی میں کمرہ گرم رکھنے تک کا انتظام نہیں۔ ایک پرانا ہیٹر اُٹھا کر لائیں جو بابا آدم نہیں تو ریمبراں صاحب کے استعمال میں ضرور رہا ہو گا۔ فرمایا بہت سردی لگے تو اسے جلا لینا۔ لیکن بجلی کا سوراخ ایک ہی ہے اسے لگاؤ تو پڑھنے کا لیمپ بند کرو۔ دوہری عیاشی نہیں کر سکتے۔ ناشتے کے لیے پوچھا کہ کتنے بجے کرتے ہو۔ ہم ذرا دیر خیز ہیں لیکن یہاں صُبح بہت جلدی ہوتی ہے لہٰذا کہا، یہی کوئی آٹھ بجے۔

فرمایا یہ تو بہت جلدی ہوا۔ سردی ہے، میں ذرا دیر سے اُٹھتی ہوں نو بجے کرو تو اچھا ہے جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کے ہیں تو بولیں پاکستان کے لوگ اس ہوٹل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک مسٹر خان ہیں، تم جانتے ہو گے وہ تو ہر سال یہیں آ کر ٹھہرتے ہیں۔

یہ وہ شہر ہے جس میں آپ تین سال تک ہز ایکسی لنسی رہے۔ سُنا ہے یہاں سفارت خانہ اور سفیر کبیر کا گھر ایک محل ہے جو ہماری حکومت نے اچھے دِنوں میں خرید لیا تھا۔ آپ کے اخلاقِ کریمانہ پر نظر کرتے ہوئے کُچھ عجب نہ تھا کہ ہم بھی اس کے کسی کونے میں فروکش ہو جاتے اور ہفتہ بھر آپ کی روٹیاں توڑتے۔ آخر پاکستان سے جانے والے اتنے لوگ یہی کرتے رہے ہیں بعضوں کو تو سُنا ہے کہ آپ نے پُر زور اصرار کر کے اور پلّے سے کرایہ دے کر وطن واپس جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ہم چھ سال قبل بھی کُچھ دِن اس شہر میں گزار گئے ہیں۔ ہوٹل اس وقت بھی کچھ ایسا اچھا نہ ملا تھا۔ لیکن کم از کم اس کا دروازہ ادوائن کی رسّی سے نہ کھلتا تھا۔ ہوٹل بالکل نیشنل میوزیم کے ساتھ والی گلی میں ہے۔ یہ میوزیم انیسویں صدی کے وسط میں بنا تھا۔ گویا ہمارے اس ہوٹل کے مُقابلے میں اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دِن جاننی چاہیے۔ آج ہمارا گزر ایمسٹرڈم ہلٹن کے سامنے سے بھی ہوا۔ یہ ہمارے ہوٹل کے مقابلے میں

بہتر معلوم ہوا لیکن ہم اپنا پانچ دِن کا الاؤنس جمع کریں، تو وہاں ایک شب قیام کر سکتے ہیں یہ تو کر لیں لیکن یہ باقی کی چار راتیں کہاں گزاریں۔ ع

اے غم دل کیا کروں

اے وحشت دل کیا کروں

ہالینڈ ہم کو پسند آیا

ایمسٹرڈم تو جیسا ہے سو ہے۔ نہروں کا ایک جال ہے۔ ہمارا خیال تھا، نہروں کی یہ اسکیم خوبصورتی کے لیے رکھی گئی ہے۔ پتہ چلا کہ یہ بات نہیں۔ پہلے چھوٹا سا شہر تھا۔ بیرونی حملے کے ڈر سے نہر کھودی گئی۔ پُل تھے جو اُٹھائے جا سکتے تھے۔ آبادی بڑھی تو نہر کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ حویلیاں اور مکان بن گئے۔۔۔ اس کی حفاظت کے لیے پہلی نہر کے متوازی نہر کا دوسرا حصار کھینچا گیا۔۔۔ پھر تیسرا۔۔۔ پھر چوتھا۔۔۔ پانچواں۔۔۔ چھٹا۔۔۔ ساتواں۔۔۔ آٹھواں وغیرہ، اور یوں جس طرح درخت کے تنے کے حلقے دیکھ کر آپ اس کی عُمر کا اندازہ کر سکتے ہیں، اسی طرح ایمسٹرڈم کا نقشہ دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنی نسلیں اور کتنی صدیاں اس شہر پر گزری ہیں۔۔۔ گول مول بات ہم اس لیے بھی کر رہے ہیں کہ جس کاغذ پر اس شہر کا سالِ تعمیر، نہروں اور پُلوں کی صحیح تعداد وغیرہ لکھے تھے ہم

سے کھو گیا ہے۔ ڈچ لوگ اور ان کا شہر ہمیں پسند آئے۔ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کی طرح ان لوگوں کو صفائی کا جنون نہیں ہے۔ آرٹسٹ لوگ ہیں۔ لندن میں تو جگہ جگہ لکھا ہے کہ اگر سڑک پر تھوکا یا کاغذ کا کوئی پرزہ پھینکا تو ہم سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ ہالینڈ میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہے، کئی بار تو یہ خوش گوار احساس ہوتا تھا کہ ہم اپنے ہی ملک میں ہیں۔ کوئی چیز اجنبی نہیں۔ بارش ہے تو کیچڑ ہے۔ کار بھی چھپ چھپ چھینٹے اُڑاتی گزر گئی ہے۔ کوئی مکان تعمیر ہو رہا ہے تو جرمنی یا انگلستان میں اس کے گرد پردہ کھینچنا پڑتا ہے، ہمارے ملک کی طرح یہ لطف نہیں کہ آپ فٹ پاتھ سے گزر رہے ہیں اور اوپر سے سیمنٹ اور ریت نیچے گر رہے ہیں۔ اینٹیں آ رہی ہیں۔ یہاں ایک فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ہم پر اوپر سے گارا گرا تو سچ یہ ہے کہ اس میں سے اپنے وطن کی مٹّی کی سوندھی سوندھی خوشبو آئی ملک سے دوری کا غم بٹ گیا۔ کاغذ چاک کر کے اس کے پرزے بھی ہم نے جہاں چاہا پھینکے کسی کے ابرو پر بل نہ آئے۔ سڑک کو بھی ہم نے جا و بے جا کراس کیا۔

جرمنی میں ہم لال بتّی پر رُک کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بہت سے ہوٹلوں اور طعام خانوں میں بھی صفائی کا معیار ہمارے ملک کے ایرانی ہوٹلوں کا سا تھا اس سے کم نہیں تھا۔ مانگنے والے بھی اتنے تو خیر نہیں تھے جتنے صدر

میں ملتے ہیں تاہم کہیں کہیں ملتے۔ سڑک پر ایک ٹھیلا سا کھڑا کر رکھا ہے جس میں گراموفون لگا ہے جو بُلند آواز سے پُر سوز گانا گا کر راہگیروں کے دل میں جذبۂ ترحم پیدا کر رہا ہے اور ایک شخص اپنا پیالہ لیے ہوئے اس میں سِکّے چھنکاتا لوگوں کا راستہ روک رہا ہے۔ البتّہ بسیں، ٹرامیں ان ظالموں نے نئی بنا دی ہیں۔ ریمبرا اں کے عہد کی نہیں رکھیں۔ یا پھر تعلیم کا معیار اچھا ہے۔ کتابیں خوبصورت چھپتی ہیں، چیزیں خالص ملتی ہیں، لوگ بااخلاق ہیں، نائی بھی اچھے ہیں۔ ہم نے یہاں آ کر بال کٹوائے، لندن والے نائی سے تو بہتر نکلا۔ پیسے بھی کم لیے، تھینک یو بھی بڑے تپاک سے کہا۔

ہاں تو کہنا یہ تھا کہ ایمسٹرڈم تو جیسا ہے سو ہے۔ ڈیلفٹ اور لیڈن دونوں کی خوبصورتی نے ہمارا جی موہ لیا۔ ڈیلفٹ تو ہم کام سے گئے تھے، ایک صاحب سے ملاقات کی ٹھہری تھی، اس کے بعد ہم نے از خود ٹاؤن ہال کے گرد کے حصّے کا چکّر کاٹا۔ ڈیلفٹ میں ایک چینی مٹّی کی صنعت پرانی ہے۔ ظروف پر، ٹائلوں پر نیلی نقش کاری یہاں کا خاص فن ہے۔ وہی رنگ کہ ملتان کی خصوصیت ہے، ڈیلفٹ میں برتا جاتا ہے اس کے علاوہ لکڑی کے جوتے۔ زیادہ تر اب سیاحوں کی تفریح طبع کے لیے بنتے ہیں۔ لیکن ہم نے ایک شخص کو پہنے ہوئے بھی دیکھا۔ معلوم ہوا سردیوں میں آرام رہتا

ہے۔ لیڈن میں ہم کو علم کا شوق لے گیا تھا کُچھ ہمارا خیال تھا (جو غَلَط نکلا) کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین بھی لیڈن ہی میں ہوتی ہے۔ ہمیں بھی

کچھ معلومات اسلام کی ہیں ہمارا ارادہ تھا ان لوگوں کو بتا کر آتے لیکن پتہ چلا کہ یہاں کے ایک ادارے کو فقط اس کی اشاعت میں دخل ہے، لائبریری کا اورینٹل شعبہ

دیکھنے کا بھی ہم نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ہمارا خیال تھا وہاں جا بجا لوگ جُبّے پہنے ڈچ لہجے میں عربی فارسی بولتے نظر آئیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا لائبریرین صاحب، کُچھ بھلا سا نام تھا ان کا، شاید عربی جانتے تھے۔ بہر حال کتابوں کے نام پڑھ لیتے تھے۔ ہم نے اُردُو کی کتابیں دیکھنے کی خواہش کی۔ فقط ماسکو کی چھپی ہوئی اُردُو روسی لُغّت نکلی اور کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو وہاں گور مکھی کی تھیں، گور مکھی کے متعلّق بھی تھیں۔ ہاں عربی کا ذخیرہ کچھ ہے یا پھر چینی جاپانی کا اور انڈونیشی ملائی کا۔ ہم کتب خانے کی کہنگی سے ضرور متاثر ہوئے اور اس میں شک نہیں کہ ڈچ زبان کی پرانی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ جرمنی اور انگریزی کی کتابیں بھی خاصی ہیں۔ ہمارا شوق الف لیلہ اور اس کے تراجم ہیں، سو چند نسخے دیکھے جو اور جگہ نہ ملے تھے۔ ان سے قطع نظر جیسے گئے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے۔

لیکن ہمیں ڈیلفٹ اور لیڈن کی گلیوں کوچوں نے بہت متاثر کیا۔ خوبصورت ٹائلوں والے مکانات۔ نہر لیڈن کے اندر بھی گزرتی ہے۔ سیر کرتے ہم پرانے ٹاؤن ہال کی طرف جا نکلے۔ سڑک کے سِرے پر ایک پَون چکّی بھی تھی مکانوں کا انداز وہی سترھویں اٹھارہویں صدی کا۔ سکائی اسکریپروں یعنی فلک نما مکانوں کی بدعت فقط راٹرڈم میں دیکھی، کیونکہ وہ شہر عالمی جنگ کی بمباری میں ملبے کا ڈھیر رہ گیا تھا۔ نئ

تعمیرات بلند مہیب اور چوکور ہیں۔ ایمسٹرڈم بھی پرانے تاجروں اور رئیسوں کی حویلیوں کا شہر ہے۔ لیکن لیڈن اور ڈیلفٹ کے نوکیلی چھتوں اور گیلری والے مکانات تو اپنی الگ ہی دلآویزی رکھتے ہیں۔ غازے سے بے نیاز گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں کی طرح۔ ایمسٹرڈم کا مشہور ٹروپن میوزیم جس میں مختلف استوائی ملکوں کے رہن سہن کا انداز دکھایا گیا ہے۔ ان کے ملبوسات گھر گھروں کا سامان، زیور، ظروف، باجے گاجے اور اوضاع اطوار۔ یہ ہم نے آنے کے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا۔ اتھنولوجیکل میوزیم ہمارا خاص شوق ہے۔ برلن کے فوکر کنڈے، یعنی معاشرتی میوزیم کا حال ہم نے مولوی محبوب عالم کے سفر نامے میں پڑھا تھا۔۔ کشاں کشاں پہنچے۔ افریقی اور چینی شعبے تو دیکھے، لیکن وہ شعبہ جو اس برِّ عظیم سے تعلّق رکھتا ہے مرمّت کے لیے بند تھا، سخت مایوسی ہوئی۔ عمارت وہی ہے جو اس صدی کے آغاز میں تھی، مولوی محبوب عالم نے لکھا ہے کہ۔۔۔

"پنجاب کے متعلّق ذخیرہ کافی نہ تھا۔ گو لاہور کے کیسرے بازار کی آٹھ آنے والی ایک چارپائی بھی پڑی تھی لیکن اس سے لوگ یہی نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ ہندوستانی صرف ایسی ہی چارپائیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایک صادق الاخبار بہاولپور کا نمونہ سیالکوٹی کاغذ پر چھپا ہوا رکھا تھا۔ میں نے وہاں رکھنے کے لیے پیسہ اخبار اور

انتخاب لاجواب کے نمونے مع ایک لکھے ہوئے مراسلہ کے جو اِتّفاقاً میرے پاس تھا۔ عجائب گاہ کے اعلیٰ افسر کے پاس بھجوادیئے جس نے مجھے بعد میں شکریے کا خط بھیجا۔"

ہمارے یہ میوزیم پورانہ دیکھ پانے کی کچھ تلافی ایمسٹرڈم کے ٹروپن میوزیم کو دیکھ کر ہوگئی۔ افریقہ اور انڈونیشیا کے شعبے خاصے بڑے ہیں اور ایشیا کے بعد اور ملکوں کے بھی جِن کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہمیں توہمات اور پسماندگی کو جھٹکنے میں ابھی کتنے قرن لگیں گے۔ ایک جگہ بدوؤں کا خیمہ بھی تنا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیسویں صدی کی معاشرت ہے۔

ایک جگہ ایک پاکستانی عورت لٹھّے کے سیدھے برقعے میں کھڑی نظر آئی۔ بعض اور اسلامی ملکوں کے برقعے تو اور بھی کمال ہیں۔ لیکن پاکستان کے شعبے میں ایک محترمہ کو ریشمی غرارہ پہنے اور پرس اٹھائے بھی دکھایا گیا ہے۔

ایک کونے میں ایک شعبہ اسلام کا ہے۔ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دِکھایا گیا ہے۔ خانہ کعبہ اور حج کی رسوم بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس شعبے میں مختلف مسجدوں کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں اور ایک طرف قران مجید اور اس کے تراجم مختلف زبانوں میں۔

اچھا اثر آفریں شعبہ ہے۔ برما اور انڈونیشیا وغیرہ کے تو پورے گھر اور دُکانیں ہیں۔ ان دُکانوں میں نون تیل پورا اصلی ساز و سامان بھرا ہے۔ بس اندر دُکاندار مصنوعی ہے۔

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا

لیجیے۔۔۔ آج چھ راتیں وہاں گزارنے کے بعد ہم ہوٹل البرز سے چلے آئے اور وہ بند ہو گیا۔ کم از کم عارضی طور پر، کیونکہ اس ہوٹل میں ہم تنہا مسافر تھے۔ ناشتے کی واحد میز پر صرف ہمارے لیے ناشتے کا انتظام ہوتا تھا۔۔۔ فقط ہمارا بستر بچھتا تھا۔ مسز البرز بازار سے فقط دو انڈے اور ایک ڈبل روٹی لاتی تھیں۔ ایک ہمارے لیے، ایک اپنے لیے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے بازار جاتی ہی نہیں تھیں۔ کیونکہ ادوائن کی رسّی کے ساتھ ساتھ سیڑھیوں میں ہم نے ایک اور تار سی بندھی دیکھی جس کے سِرے پر چھینکا لٹکا ہوا تھا۔۔۔ انڈے ڈبل روٹی والا صُبح صُبح آ کر گھنٹی بجاتا تھا۔ مسز البرز، ادوائن کو جھٹکا دیتیں اور دروازہ کھُل جاتا، وہ چھینکے میں سامان خورد و نوش رکھ کر اور گڈ مارننگ کا آوازہ بُلند کر کے دروازہ بند کر دیتا اور یوں یہ ہوٹل چل رہا تھا اور ہم اس میں چل رہے تھے اور کرایہ مع ۱۵ فیصدی سروس کے دے رہے تھے۔

قاعدے سے یہ ۱۵ فیصدی سروس ہمارا حق بنتا تھا کیونکہ ہوٹل کے مسافر (خواہ ہم خود ہی تھے) کا سامان اُوپر چڑھانا اُتارنا ہمارا کام تھا۔ دروازہ کھولتے بند کرتے ہم خود تھے۔ کوئی فون آتا تھا تو دوڑے دوڑے کاریڈور میں ہم جاتے تھے۔ صابون ہم اپنا برتتے تھے۔ جوتے ہم اپنے خود پالش کرتے تھے۔۔۔ رات کو اس ہوٹل میں عجیب سنّاٹا ہوتا تھا۔

منظر بھی حسیں چہرے بھی حسیں ایسے کہ کبھی دیکھے ہی نہیں
پر اپنے لئے تو شہر نہ بن آتی ہے پون، جاتی ہے پون

رکنے کی نہیں جا۔ اُٹھ بھی چُکو کسی اور نگر چلیں اجنبیو

سینے میں لیے سینے کی دکھن آتی ہے پون، جاتی ہے پون

اس کی تیسری منزل پر ڈیوڑھی والے کمرے میں ہم، نیچے نہ جانے کہاں مسز البرز۔ انگریزی بولتی ضرور تھیں۔ لیکن زبان میرؔ اور کلام میرزاؔ کی طرح خود ہی سمجھتی ہوں گی۔ ہماری خدمت نہ کر سکنے کا انہیں ملال تھا۔ کیونکہ بقول ان کے ان کی صحت اچھی نہ رہتی تھی۔ حالانکہ عمران کی ۶۷ سال سے زیادہ نہ تھی۔۔۔ ہمیں اُن کا ہوٹل چھوڑنے کا قلق ضرور ہوا۔ لیکن یہ خوشی ہے کہ بے چاری کو اب کسی مسافر کے لیے ناشتے وغیرہ کا تردّد نہ کرنا پڑے گا۔ کل صُبح آرام سے پاؤں پسار کے سوئیں گی۔ یہ امکان کم معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شامت کا مارا مسافر وہاں آ نکلے۔ ایک روز ایک شخص آیا ضرور تھا۔ کمرے دیکھنے کے بعد بولا۔ ''اچھا میں ابھی آیا۔''

لیکن۔ ع

جو مُجھے دیکھنے کو آتا ہے پھر مُجھے دیکھنے نہیں آتا

اب ہم میوزیم ہوٹل میں ہیں۔ جو بالکل ساتھ والی گلی میں ہے۔ مسز البرز سے ہم

نے جھوٹ بولا ہے کہ ہم دوسرے شہر ۔۔۔ ہیگ میں جا رہے ہیں۔ کیونکہ اب ہمارا کام وہاں ہے، ایمسٹرڈم میں نہیں ہے۔ ہم سعدی کے چیلے ہیں۔ دردغ مصلحت آمیز کے قائل ہیں۔ ہمارا یہ اچھا صاف ستھرا کمرہ ہے۔ سیڑھیاں بھی ہوٹل البرز کے مُقابلے میں آدھی۔ ہُو کا عالم بھی نہیں ہے کیونکہ نیچے سامان اٹھانے کو ہری جیکٹ والے دربان۔ کاؤنٹر پر دو لڑکیاں۔ ایک طرف کو ناشتے کا کمرہ اور ریستوران جس میں مکلّف وردیوں والے بیرے ترت پھرت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ مسافروں کی ریل پیل مرکزی ہیٹنگ بھی ہے۔ مسز البرز نے ہمیں ہیٹر کہہ کر جو آلہ دیا تھا اس میں سے ہوا تو آتی تھی ۔۔۔ گرمی ہم نے نہ دیکھی۔ اسے کئی بار اُٹھا کر ہم نے گود میں بھی رکھا کُچھ فائدہ نہ ہوا۔ شب بھر ٹھر ٹھر کرتے تھے۔ تولیے کی جگہ چار گرے کا ایک رومال تھا اور اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب یہ تھی کہ چھ دِن میں تو بدلا نہیں گیا۔ واش بیسن میں ڈاٹ تو لگتی ہی نہیں تھی۔ دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور گرم پانی کی ٹونٹی کھولیے تو کھولتے چلے جائیے ۔۔۔ دو تین منٹ کے بعد ٹپکا شروع ہوتا تھا۔ غالباً پانی تو خوب فوّارے کی طرح آتا تھا۔ اس میوزیم ہوٹل کے کمرے کی دیوار کو ہم نے ٹہکا دیا۔ ٹھوس دیواریں تھیں بلکہ ایک پر تو لکڑی کے خوبصورت تختے بھی لگے ہیں۔ ہوٹل البرز میں ہمارے کمرے کی دیواریں تحقیق نہ ہوا کہ کس

مسالے کی تھیں۔۔۔ انگلی سے دباؤ تو اتنی دیوار اندر کو دب جاتی تھی۔ ہمارا خیال ہے موٹا کاغذ تھا۔ اس کے پیچھے خلا تھا اور خلا کے پیچھے جانے کیا۔ کُچھ نہ کُچھ تو ہو گا۔ خلا کی کھوج لگانے کا جنون روسیوں کو ہے، ہمیں نہیں ہے۔

مصروفیت سُنیے کہ صُبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے اور ہمارا کام تمام کرتی ہے۔۔۔ ہر روز ایک نئی منزل سر پر کھڑی ملتی ہے کل صُبح ۹ بجے ایک صاحب سے ڈلفٹ میں ملنا تھا۔ ایمسٹرڈم سے گاڑی ۷:۵۴ پر چلتی ہے اور ۸:۵۴ پر

پہنچاتی ہے۔ ۷:۵۴ پر چلنے کے لیے اسٹیشن پر پندرہ بیس منٹ پہلے پہنچو۔ ٹکٹ لو اور پلیٹ فارم تلاش کرو۔ اس کے لیے آدھ میل دور جا کر سولہ نمبر کی ٹرام پکڑنی چاہیے۔ اس کے لیے گھر سے کم از کم سات بجے چلو اور چونکہ فیشن کا انتظامِ صفائی بھی ضرور ہے یعنی شیو کرو۔ منہ ہاتھ دھوئو۔ کپڑے پہنو تو چھ بجے اُٹھو۔ یعنی نور کے تڑکے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں؟ خیر مسز البرز سے ٹائم پیس مانگا۔ ڈلفٹ گئے۔۔۔ انہوں نے پہلے ہی فون کر رکھے تھے، ایک اور شہر میں رائٹر ڈم ہیں۔۔۔ نیا ٹکٹ لیا اور وہاں بھی جا اُترے۔ وہاں کے کام بھگتائے تو پھر ہیگ آئے۔ کیونکہ ہیگ کے پاس ایک قصبہ ہے جہاں وزارتِ خارجہ کے دفاتر ہیں اور وزارتِ خارجہ کے ایک افسر ہماری ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے بشرطیکہ ہم ان کے پاس پہنچیں۔۔۔ یہ تجربہ ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ یہاں کے لوگ بے حد بااخلاق ہیں۔ اگر ان کو کوئی راستہ معلوم نہیں تو بھی ٹکہ سا جواب نہ دیں گے بلکہ کُچھ نہ کُچھ بتائیں گے ضرور۔ کوئی نہ کوئی ٹرام کا نمبر بتادیں گے۔ بس نمبر بتادیں گے۔ یا انگلی سے کسی طرف اشارہ کر دیں گے۔ چنانچہ کسی نے ہم سے کہا۔ دس نمبر ٹرام لو، فوربرگ کے اسٹیشن پر پہنچے گی۔۔۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ وہاں اُترے اور کسی کو پتے کی چِٹ دکھائی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے یک بیک وقت چاروں سمتوں میں اشارے کرنے لگے

آخر ۲۳ نمبر کی بس لی۔۔۔ اس کے ڈرائیور نے ایک جگہ اُتار دیا اور کہا۔۔۔ یہاں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ اس سڑک پر دور دور تک آدم نہ آدم زاد، اور بارش اور سردی اور ہوا کے جھونکے۔ کوئی نئی بستی تھی۔۔۔ ایک لڑکا ایک مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم ڈگ بھرتے وہاں ابھی پہنچے نہ تھے کہ سائیکل پر چڑھ کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ ایک اور صاحب کی طرف ہم بھاگے دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گیا تھا کہ وہ ایک بس میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بھلے مانس کو چوراہے میں کاغذ دکھایا۔ اتنے میں ان کے مطلب کی بتّی سبز ہو گئی۔۔۔ اور وہ ہمیں کاغذ لہراتا چھوڑ راستہ عبور کر گئے۔ خیر بارش سردی ہوا کے باوجود ایک صاحب نے رُک کر کہا۔ یہاں تو تمام گھر ہیں۔ کوئی سرکاری دفتر اِدھر نہیں ہے۔ ہم نے ایک اونچی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ تو بولے، وہاں وہ البتّہ سرکاری دفتر ہے لیکن معلوم نہیں کاہے کا ہے۔ خیر ہمیں اطمینان ہوا کہ وہ دفتر مطلوبہ نہ ہوا تو کم از کم پتہ تو ملے گا۔ وہاں کا دربان واقعی خضر راہ نکلا۔ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ لیکن میز کی دراز میں سے ایک انگریزی میں چھپی ہوئی پرچی نکال لایا۔

”جہاں آپ کھڑے ہیں وہاں سے فلاں سڑک پر چل دیجیے۔ داہنے ہاتھ کی پہلی دو گلیاں چھوڑ کر تیسرے پر بائیں ہاتھ مڑیے۔ وہاں سے پہلی گلی داہنی طرف پار کیجیے

اور آخری بار بائیں ہاتھ مُڑ جائیے۔ وزارتِ خارجہ کی عمارت بالکل سامنے ملے گی۔"

معلوم ہوا ہمیں کو نہیں۔۔۔ یہ مسئلہ اور لوگوں کو بھی درپیش ہوتا ہے۔ اس لیے پرچیاں چھپوالی گئی ہیں۔ بہر حال شکریہ ادا کر کے ہم چل دیے۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری پر بائیں ہاتھ مُڑے۔ پھر داہنے سے ہاتھ سے مڑے اور پھر آخری بار بائیں ہاتھ مُڑے تو آگے کچھ نہ تھا۔ ریل کی لائن تھی۔۔۔ اور اس پار خالی کھیت تھے۔ ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے۔ ان صاحب سے ملنا بھی ضرور تھا۔ کیونکہ بات ہمارے مفاد کی نہیں، ہمارے ملک کے مفاد کی تھی۔ شام بھی ہو رہی تھی۔ پھر ہم بس کا راستہ بھی بھول چکے تھے۔ پھر ٹرام لینی تھی۔ پھر ہیگ سے گاڑی پکڑنی تھی۔ پھر ٹرام لینی تھی۔ پھر پیدل چلنا تھا پھر مسز البرز کے ہوٹل کی ۵۷ سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔ منزل تیری دور مسافر، منزل تیری دور۔

آخر جب ہم مایوس ہو چکے تھے۔ اِتّفاقاً وہ دفتر ہمیں مل گیا۔ صاحب موصوف البتّہ نہیں تھے ہم خستگی سے بے ہوش ہونے کو تھے کہ وہ آگئے۔ بولے "اُمّید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہو گا اور یہاں کا راستہ آسانی سے مل گیا ہو گا؟"

ہم جی کڑا کر کے چہرے پر مُسکراہٹ لائے اور کہا۔۔۔ "جی ہاں!"

آج شام ہمیں علم کا شوق اور فرض کی محبّت لیڈن لے گئی۔ وہاں سے بھی بارش میں شرابور چھپ چھپ کرتے آئے اس وقت ہمارا کوٹ وارڈروب میں لٹکا نُچڑ رہا ہے اور جوتا بھی۔ کل صُبح پھر شہر سے باہر ایک اپائنٹمنٹ ہے۔ ہمارا جی ابھی سے ہول کھا رہا ہے آپ کہیں گے ہم کیوں نہیں فون کر کے ٹیکسی طلب کرتے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور پتے کی پرچی ڈرائیور کے حوالے کر کے نچنت ہو جاتے اور سگریٹ سلگا لیتے، وہ جانے اس کا کام۔

ہمارے اس تھوڑا لکھے کو بہت جانیے کہ اس کی وجوہ اقتصادی ہیں۔

ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے

ایمسٹرڈم میں جب ہم اپنے کاموں سے کچھ کچھ فارغ ہوئے تو ایک صاحب سے ہم نے پوچھا۔ اب ہمارا یہاں سے چل چلاؤ ہے ہم نہیں چاہتے کوئی چیز ہمارے دیکھنے سے رہ جائے یہاں کی کیا کیا چیزیں مشہور ہیں؟

بولے۔ ”پنیر۔“

ہم نے کہا۔۔۔ ”وہ ہم نے کھا لیا، بلکہ قدرت اللہ شہاب صاحب کے ہاں کھا کے آئے تھے۔ وہ دو تین سال کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”دوسری چیز یہاں کی پَون چکیاں ہیں۔“

ہم نے کہا ”وہ بھی دیکھ لیں۔۔۔ اور؟“

سوچ کر بولے۔ ”یہاں کے پینٹر مشہورِ زمانہ ہیں۔“

ہم نے اُن کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیرا۔

ایمسٹرڈیم کے ریتخ میوزیم میں

بولے۔ ”میرا مطلب دروازوں، کھڑکیوں پر رنگ کرنے والوں سے نہیں ہے۔ پینٹر تم نہیں جانتے کیا ہوتا ہے؟“ اب کُچھ کُچھ ہماری سمجھ میں آیا۔ ہم نے کہا۔ ”معاف کرنا۔ اب ہم سمجھے۔ ہمارے ہاں بھی بڑے اچھے پینٹر ہیں۔ ایک سے ایک عمدہ سائن بورڈ آپ کو نظر آئے گا بلکہ شہر کی دیواروں پر لکھنے والوں میں ایک نامی گرامی پینٹر اللہ دیا ممتاز ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ شاعر بھی ہے۔ ممتاز اس کا تخلّص ہے۔ تخلّص جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟

فرمایا۔ ”میرا مطلب دیواریں چھاپنے والے یا سینما کے بورڈ بنانے والے پینٹروں سے بھی نہیں ہے۔ ریمبراں کا نام تُم نے سُنا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”ایک ہفتہ تو ہمیں یہاں آئے ہوا ہے۔۔۔ اس میں بھی زیادہ تر مصروفیت رہی۔ آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ رام رام۔۔۔ کیا نام بتایا تم نے اس کا؟“

انہوں نے روکھے پن سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ریخ میوزیم یعنی قومی میوزیم بالکل ہمارے میوزیم ہوٹل کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ہوٹل کا نام اس کی وجہ سے رکھا گیا ہے یا یہاں میوزیم ہمارے

ہوٹل کی رعایت سے بنایا گیا ہے بہر حال جس کسی سے بات ہوئی اس نے ہم سے یہی پوچھا۔ تم نے ریخ میوزیم دیکھا کیا؟

آخر ہم نے سوچا دیکھ ہی ڈالنا چاہیے۔ ہفتہ کی صُبح ہماری خالی تھی۔ جا گھُسے۔ معلوم ہوا تصویروں کا میوزیم ہے۔ کچھ مجسّمے ہیں اور پرانا کاٹ کباڑ فرنیچر بھی ہے۔ سولہویں صدی کا۔ سترھویں صدی کا۔ ہم تو یہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز پرانی ہوئی۔ مثلاً چارپائی ٹوٹنے لگی یا کرسی کا ہتھّا اُکھڑ گیا تو اُسے پھینک دیا یا آگ جلالی۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں کرتے۔ پرانی چیزوں کو سینت سینت کر رکھتے ہیں چنانچہ کئی کمرے پرانے فرنیچر سے بھرے ہوئے دیکھے۔ ہمارے گھر میں بھی پندرہ، پندرہ بیس بیس سال کے کھٹولے، میز، ٹرنک، بدھنے، مرتبان، کیلنڈر، چمچے، سُرمے دانیاں، توشک وغیرہ بھرے پڑے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر و قیمت کا خیال نہ آیا۔۔ اگر ہمارے آنے تک ہمارے گھر والوں نے پھینک نہ دیے ہوں تو ہم بھی میوزیم بنائیں گے۔ یہ چیزیں تو پھر حال کی ہیں۔ بعض میوزیموں میں تو ہم نے پچیس پچیس، تیس تیس صدی پرانی اور بے کار چیزیں سجی دیکھیں۔

ہم نے کہا۔ ”یہ کچھ نہیں۔ کچھ اور دکھاؤ۔“

تب ایک گائیڈ نے ہمیں ویلفٹ کی پرانی ٹائلوں کا ذخیرہ دکھایا۔ اس وقت تو ہم نے تعریف کی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ویسی ہیں جیسی شوکت صدیقی نے اپنے پھاٹک کے ستونوں پر لگا رکھی ہیں، کوئی کمال کی بات نہیں۔

اس کے بعد تصویروں کے کمروں کا نمبر آیا۔ ہم نے سُنا تھا کہ ریمبراں نامی مصوّر نے ''نائٹ واچ'' نام کی جو تصویر بنائی تھی اس کی وجہ سے یہ میوزیم دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ریمبراں کی بہت سی اور تصویریں بھی اس میوزیم میں بتائی گئیں ایک اور شخص کی بھی جس کا نام ''فان گوگ'' یا ایسا ہی کچھ تھا جس شخص کا نام ایسا عجیب و غریب ہو وہ بھلا کیا تصویریں بنائے گا۔

خیر ہم نے میوزیم کا ٹکٹ خرید ا تھا۔ اب تصویریں دیکھنی تھیں۔ ہم نے کراچی آرٹ کونسل میں تصویروں کی کئی نمائشیں دیکھی ہیں اور خود بھی ایک زمانے میں آرٹ سے شغف رہا ہے جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔ ماسٹر محمد دین ہماری ڈرائنگ کی کلاس لیا کرتے تھے اور ہم سے سیب، کیلے، گلاس، مرتبان، طوطے اور مور وغیرہ بنوایا کرتے تھے۔ ہمارا ہاتھ ہمارے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ رواں تھا۔

خود ماسٹر محمد دین بڑے باکمال آرٹسٹ تھے۔ لیکن ہائے بے قدری زمانہ۔۔۔ ہمیں تو کوئی کیا جانے گا۔ آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ سوائے ان کے شاگردوں کے۔۔۔وہ بھی شاید اس لیے کہ مارتے بہت تھے۔

اس میوزیم میں کمرے ہی کمرے ہیں۔ سب تصویروں سے بھرے ہوئے بعض تصویروں کے چوکھٹے بے حد خوبصورت ہیں۔جی چاہتا تھا کہ چوکھٹا نکال لیں اور اس میں اپنی تصویر لگائیں۔ ایک تصویر میں ایک شخص تلوار لگائے کھڑا تھا۔ پیچھے چاند بھی نکلا ہوا تھا۔ ہم نے کہا یہ "نائٹ واچ ہے؟ بڑی خوبصورت تصویر ہے۔"

محافظ نے بتایا "نہیں! یہ نائٹ واچ نہیں ہے۔وہ تو ریمبراں کا شاہکار ہے۔ گیلریوں میں چلتے جاؤ۔ آگے ملے گا۔"

آگے ایک کمرے میں ایک کلاک کی تصویر تھی۔ ہمیں خیال آیا شاید واچ سے مطلب گھڑی ہو ہم نے اس کمرے کے محافظ سے کہا "یہ تو نہیں ریمبراں کی نائٹ واچ؟"

معلوم ہوا۔۔۔"یہ بھی نہیں ہے، آگے ہے۔"

خیر تصویریں دیکھتے نام پڑھتے، تحسین اور آفرین کے طور پر سر ہلاتے ہم ایک بڑے ہال کمرے میں پہنچے۔ بہت سے لوگ ایک تصویر کے گِرد کھڑے تھے۔ کسی نے ہمیں اشارے سے بتایا۔ "یہ ہے ریمبراں کی نائٹ واچ۔"

بہت بڑی تصویر ہے۔ پوری دیوار ڈھانپ رکھی ہے۔ دوسروں کی طرح ہم نے بھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، عینک لگا کر دیکھا، عینک اُتار کر دیکھا۔ اس کمرے میں اس تصویر کو دیکھنے کے لیے صوفے بھی لگائے گئے ہیں ہم نے بھی اُن پر ٹھیکی لی۔ اس میں سامنے ایک بادشاہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو بادشاہ ہی ہو گا۔ ساتھ ایک ٹوپی والا جرنیل سمجھ لیجیے، ایک شخص بندوق لیے بھی کھڑا ہے۔ تصویر کے دہنے ہاتھ ایک ڈھول والا ہے۔ پیچھے کی جگہ بھرنے کے لیے کچھ اور آدمی بھی دِکھائے گئے ہیں۔ کسی کا منہ کسی طرف کو ہے۔۔۔ کسی کا کسی طرف کو۔۔۔ ذرا ٹھہریئے۔ کتاب میں دیکھیں ہم نے میوزیم کی گائیڈ بھی تو خریدی ہے۔ دیکھیے صفحہ ۱۵ اور ۱۶۔۔۔ "ریمبراں۔۔۔ ریمبراں۔۔۔(۱۶۰۶-۱۶۶۹ء) اپنے زمانے کا بہت بڑا آرٹسٹ تھا(بے شک اپنے زمانے کا ہو گا۔ ہم نے سوچا)لیڈن کا رہنے والا تھا۔ پھر ایمسٹرڈم چلا آیا اور جب تک مر نہیں گیا وہیں رہا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں یہودی دُلہن۔۔۔ پطرس ولی کا انکار (۔۔۔ ارے یہ کیا فضول۔۔۔ تفصیلات ہیں،

نائٹ واچ کا ذکر آنا چاہیے)۔۔۔ یہ رہا لکھنے والا لکھتا ہے کہ ریمبر اں کو غالباً۔۔۔ (یعنی یقین نہیں اور گائیڈ لکھنے بیٹھ گئے ہیں) اس وقت یہ تصویر بنانے کو کہا گیا تھا جب فرانس کی بیوہ ملکہ میریاڈی میڈ یلیتی ۱۶۳۹ء میں ایمسٹرڈم آئیں۔ یہ تصویر کپتان فرانز بننیگ کوک اور لیفٹیننٹ ولیم خان روٹن برگ کی کمپنی کی ہے۔ لیجیے جن کو ہم نے بادشاہ اور جرنیل سمجھا تھا وہ فقط کپتان اور لفٹین وغیرہ نکلے۔ اتنا بڑا آرٹسٹ۔ کسی کرنیل جرنیل کی تصویر بنائی ہوتی تو ایک بات تھی۔ چلیے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ تصویر حسبِ فرمائش بنائی گی ہے۔ اپنی مرضی یا شوق سے نہیں ایسا کام پھر ٹالا جاتا ہے۔ کتاب بند کر کے ہم نے تصویر پر پھر غور و فکر شروع کیا۔۔۔ دیکھا کہ اس میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ لوگ زندہ اور جاگتے معلوم ہو رہے ہیں۔ پیچھے تاریک محراب نے سارے منظر کو اُبھار دیا ہے۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔ گویا بُری تصویر نہیں۔ کم از کم ہماری رائے تو یہی ہے۔

نائٹ واچ دیکھ لی نیشنل میوزیم میں کُچھ اور شعبے بھی تھے۔ ایک پرنٹ روم۔ ایک ڈول ہاؤس! اب یہ دیکھیے باقی تھے۔ ایک جگہ کچھ چینی جاپانی کتابیں اور خاکے سے پڑے تھے۔ ہم نے محافظوں سے کہا۔ تصویریں تو ہم نے ساری دیکھ لیں۔ یہ پرنٹ روم کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

بولا۔ ”جناب! یہی تو پرنٹ روم ہے۔“

آگے پھر ایسی واردات ہوئی۔ ہم نے ڈول ہاؤس کا پتہ پوچھا۔ محافظ بولا۔

حضور، ”آپ اس وقت ڈول ہاؤس میں کھڑے ہیں۔“

ہم نے کہا ”باہر جانے کا راستہ کون سا ہے۔“

اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ ویسے Exit لکھا بھی تھا۔

ہم نے صدر دروازے پر اپنا کوٹ لیا۔ چوکیدار کو ٹِپ دی اور باہر نکل آئے۔ باہر خوشگوار موسم تھا۔

سوئٹزر لینڈ

۶ نومبر تا ۱۱ نومبر ۱۹۶۷ء

RECEPTÖ

ہوٹل ساں ساں ساں

انسان بھی کیسا پکھیرو ہے۔ صُبح ہم ایمسٹرڈم میں تھے، اس وقت جنیوا میں ہیں بلکہ دوپہر سے پہلے ہی آن اترے تھے، اتوار کا روز۔ ہمیں یہ تو خیر توقّع نہ تھی کو کوئی ہار گلدستے جھنڈیاں اور ڈھول تاشے لے کر ہمارا استقبال کرے گا۔ ان کرنٹوں کو ہماری قدر کیا معلوم۔۔۔ تاہم اب تک یہ ہوتا تھا کہ عموماً ہوٹل کی خبر ہوتی تھی۔ یہ معلوم رہتا تھا کہ کل کہاں کس سے جا کے ملنا ہے بعض اوقات یورپ والے پردیسیوں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ یعنی ہم فرینکفرٹ میں آ کے اُترے ہیں اور دارالحکومت اُن لوگوں نے بون بنا رکھا ہے۔ سوئٹزر لینڈ میں جنیوا اچھی جگہ ہے۔ ہمارے جہاز کو یہیں اُترنا ہے لیکن سوئٹزر لینڈ کی حکومت جہاں تک ہمارا خیال ہے برن میں ہے۔ سوایجوکیشن کے انٹرنیشنل بیورو کا نام تو ہمیں معلوم تھا اور یہ کہ ہمیں وہاں جانا ہے لیکن یہ پوچھنا ہم بھول گئے تھے کہ کہاں ہے۔ کس نگر

میں ہے۔ خیر ہم نے سوچا اس وقت تو کہیں ٹھکانہ ڈھونڈو کل صُبح معلوم کریں گے۔ برن جانا پڑا تو جائیں گے۔ پس سوِس ائیر کے کاؤنٹر پر بیٹھی کومل نار سے ہم نے کہا کہ قربانت شوم۔ ہمیں کوئی ہوٹل بتا دو۔ مُفت کا ہو تو کیا کہنے ورنہ ہم کرایہ بھی تھوڑا بہت دینے کو تیّار ہیں۔ ہو فرسٹ کلاس، غُسل خانے کی ضرورت نہیں ہے، ہوٹل بھی آس پاس چاہیے جہاں ممکن ہو تو ہم اپنا سوٹ کیس خود اُٹھا کر لے جا سکیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔

اس بی بی نے کہا "آج تو اتوار ہے۔ آج تو ٹورسٹ دفتر تک بند ہیں جو اس قسم کے انتظام کیا کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بولیں۔ "کچھ نہیں۔"

ہم نے اِدھر اُدھر نظر دورائی اور کہا۔ "تو آج کی شب اسی بنچ پر نہ استراحت کر لیں۔"

گھبرا کر کہنے لگیں۔ "نہیں نہیں، ٹھہریے میں کوشش کرتی ہوں۔"

اب اس نے ایک فہرست دیکھی۔ ایک دو جگہ فون کیا اور پھر کہا۔ ”ہوٹل ساں ساں ساں میں چلے جائیے۔ نکّڑ پر ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ کیا نام ہوا۔ ہمیں لکھ کر دو۔“

وہ ساں ساں نہیں تھا۔۔۔ ہمارے ہی کان ساں ساں کر رہے تھے۔

ساں یر دے تھا St. Gervais انگریزی قاعدے سے سینٹ جرویس ہونا چاہیے۔ جرویس صاحب کوئی سادھو سنت ہوں گے مسیحی مذہب کے۔ ایک نقشے پر اُس بی بی نے نشان بھی کر دیا کہ اس سامنے کے چوک کو پار کر کے گرجا ملے گا اور اس گرجا کے بس پیچھے ہے۔ ہم خوش خوش سوٹ کیس اُٹھائے باہر نکلے تو اس چوک کے چاروں طرف گرجا نظر آئے۔ چاروں طرف تو خیر نہیں تین طرف۔ کیونکہ چوتھی طرف سے تو ہم خود آرہے تھے جو ایئر ٹرمینل بھی تھا اور جنیوا کا بڑا ریلوے اسٹیشن بھی۔ بیٹھ کر نقشے کا مطالعہ شروع کیا۔ کچھ اس کا اُلٹا سیدھا سمجھ میں نہ آیا۔ خاصی عقلِ سلیم خرچ کی تو سمجھ میں آیا کہ دہنی طرف کو جانا ہے۔ تھوڑی دیر غور کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہمارا دایاں ہاتھ کون سا ہے۔ چنانچہ اُدھر کو رواں ہوئے۔ گرجا کے چاروں طرف گھوم گئے کبھی کعبہ مرے پیچھے تھا، کلیسا مرے

آ گے۔ کبھی کلیسا مرے پیچھے تھا اور۔۔۔ خیر۔۔۔ آخر تھک گئے۔ اس نام کا ہوٹل نہ ملا۔ ہاں اور ناموں کے ہوٹل ضرور نظر آئے آخر ہم نے سامان باہر رکھا اور ایک ریستوران میں گھُس گئے اور بیرے سے کہا۔ "ہوٹل ساں یروے کدھر ہے موسیو۔"

ہم تو خیر فرنچ میں اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ اس شخص کو مسٹر کی بجائے موسیو کہہ کر خطاب کیا لیکن وہ شخص انگریزی سے بالکل ہی کورا نکلا۔ کاندھا جھٹک کر رہ گیا۔ ایک اور شخص نے جو بیٹھا چائے پی رہا تھا البتّہ ازراہِ ہمدردی تین چار منٹ تک بڑی وضاحت سے ہمیں یہ بتایا۔ لیکن وضاحت چونکہ بزبان فرانسیسی تھی اس لیے ہم مرسی کہہ کر باہر نکل آئے کہ کسی اور سے پوچھیں گے یا کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں گے۔

اور ہم نے یہی کیا۔ ایک ہوٹل میں گھُس گئے اور کہا۔ کمرہ چاہیے۔ سنگل واجبی کرائے کا۔ منیجر نے کہا۔ "واجبی کرائے ہی کا ہے۔ ۵۲ فرانک روزانہ، ۱۵ فیصد سروس، اس کے علاوہ ناشتے کے پیسے اِسی کرائے میں شامل ہیں الگ نہیں ہوں گے۔"

اس آخری پیشکش کا تو ہم نے موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا لیکن ہمیں جو روزینہ ملتا ہے اُس کے حساب سے ہمیں ۱۵ فرانک کا کمرہ چاہیے تھا۔ حد سے حد سب کُچھ ملا کر ۲۰ فرانک کا۔

آخر ہم نے کہا۔ "ہوٹل ساں یردے کہاں ہے؟ ہماری وہاں ریزرویشن ہو چکی ہے۔ ورنہ ہم ضرور آپ کے ہاں ٹھہرتے۔ آئندہ سہی۔"

منیجر اور بیرا دونوں با اخلاق آدمی تھے ورنہ بعض ملکوں میں تو ایسے مسافر کو دھکّے دے کر باہر نکال دیتے ہیں۔ بیرے نے کہا "وہ سامنے گلی ہے اُس میں بائیں ہاتھ کو تیسرا امکان ہوٹل سان یردے ہے۔ گُڈ بائی سر۔"

ہم نے کہا۔ "گُڈ بائی" اور پھر سوٹ کیس اُٹھالیا۔

اب یہ ہوٹل کیسا ہے ہم ہوٹلوں کے متعلّق لکھتے لکھتے تنگ آ گئے ہیں ہمیشہ یہی لگا کہ ہوٹلوں میں سیڑھیوں کے نیچے ڈیوڑھی کے اوپر، کسی کونے کھدرے میں جہاں کوئی گلیارا سا ہوتا ہے اس میں لوگ ایک حجرہ بنا کر اسے ہمارے لیے ریزرو کر دیتے ہیں۔ بہر حال ہم اس ہوٹل میں خوش ہیں اور آئندہ بھی ہر ہوٹل میں خوش رہیں گے کیونکہ ایمسٹرڈم میں مسز البرز کے ہوٹل میں چھ راتیں گزار چکے ہیں۔ اب ہمیں

کہیں تکلیف نہیں ہو سکتی۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر

نظمِ حسرت میں وہ مزا نہ رہا

ہوٹل والے نے ہمارا سامان تو رکھ لیا لیکن ابھی گیارہ بجے تھے۔ فرمایا بارہ بجے سے دِن شروع ہوتا ہے۔ اُس وقت آیئے گا۔ فی الحال باہر کی ٹھنڈی ہوا کھایئے گا۔

ہم نے کہا۔ "ہاں ہمارا ارادہ بھی فی الحال سیر کا ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہمارے سامان کو سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔"

ہم نے ابھی ابھی پانچ پاؤنڈ کا نوٹ بھنایا تھا۔ ڈٹ کر ایک پاؤنڈ کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد موچھوں۔۔۔ یا موچھوں کی جگہ پر تاؤ دیتے ہوئے نقشہ دیکھ کر جھیل کی راہ لی۔

جب ہم آئے ہیں تو موسم ٹھیک تھا۔ لیکن ریستوران سے نکلے تو بارش شروع ہو گئی تھی اور سردی بھی۔ جھیل کے ساتھ ساتھ ہم تھوڑی دور تک تو کُچھ بھیگتے اور کُچھ بچتے گئے لیکن کنپٹیاں اور کان سُن ہو گئے۔ موسم ہمارے سامنے کیا چیز ہے۔ موسم کی ہم تھوڑا کیے پروا نہیں کرتے جہاں ہمارے دُشمنوں کا بال بیکا ہوا۔ ہم نے ڈاکٹر

محمد سرور کو فون کیا لیکن یاد آیا کہ یہ تو کراچی نہیں جنیوا ہے میاں۔ ڈاکٹر آیا بھی تو فیس مانگے گا اور فیس تم نے منہ مانگی نہ دی تو تمہارا یہ سوٹ کیس اُٹھا کر لے جائے گا۔ ٹاپتے رہ جاؤ گے۔ پس چلو واپس ہوٹل۔ بارہ بھی بج رہے تھے۔ اس وقت تو ہم آ گئے اور ٹھر ٹھر کرتے سو گئے۔ شام کو پھر نکلے۔ جنیوا کے اِرد گرد پہاڑ والی برف پوش چوٹیاں ہم نے جہاز ہی سے دیکھ لی تھیں اور جھیل بھی۔ اصل میں ہمارے اب یہاں اُترنے کی حاجت نہ رہی تھی کیونکہ لوگ یہی چیزیں دیکھنے یہاں آتے ہیں۔ بازار میں شیشوں کے پیچھے گھڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آئے ہر شکل صورت کی گھڑیاں، ہر قیمت کی گھڑیاں، سو گھڑیوں کے تاجروں کو تو یہاں ضرور آنا چاہیے۔ لیکن باقی لوگ کیوں آتے ہیں یہ ہماری سمجھ میں آیا۔ ایمسٹرڈم میں موسیو فان لیئر نے کہا۔ میں تو ہمیشہ بھری سردیوں میں سوئٹزرلینڈ جاتا ہوں اور اپنی چھٹّی وہاں گزارتا ہوں۔ ہم نے کہا سردیوں میں تو وہاں سردی ہوتی ہو گی بلکہ برف بھی۔ بولے برف ہی کی خاطر تو جاتا ہوں۔ عجب لوگ ہیں برف دیکھنے اتنی دور آتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے گھروں میں ریفریجریٹر نہیں ہیں۔ ہم نے یہاں کی برف دیکھ لی ہے۔ اب سوئٹزرلینڈ کی یاد آیا کرے گی تو اپنے فریج کا اوپر کا خانہ کھول کر دیکھ لیا کریں گے۔ اب رہا برف پر پھسلنے کا شوق، سو ہر شوق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک

زمانہ تھا جب ہم بھی جس چیز کو، جس صورت کو دیکھتے تھے اس پر پھسل پڑتے تھے۔ اب وہ بات نہیں آج ہی شام جنیوا کی جھیل کو بھی چل پھر کر بنظرِ غائر ہم نے دیکھ لیا۔ اس میں ہمیں پانی تو نظر آیا اور کوئی خاص بات دِکھائی نہ دی۔ سوئٹزرلینڈ اور اس کے پہاڑ اور اس کی جھیلیں اور ان کی خوبصورتی۔ قارئین کرام۔ یقین کیجیے۔ سب پروپیگنڈا ہے پروپیگنڈا۔

کھولنا اکاؤنٹ سوئٹزر لینڈ میں

اے لوگو! اے وہ تمام لوگو جن سے ہم صمیمِ قلب سے وعدے کر کے چلے تھے کہ تمہارے لیے کیمرہ لائیں گے، تمہارے لیے گھڑی لائیں گے۔ تمہارے لیے ٹیپ ریکارڈر لائیں گے۔ سب کچھ بھول جاؤ اور ولایت کے پتے پر ہمیں خط لکھ دو کہ تم نے ہمیں معاف کر دیا۔ بخش دیا۔ ہم تم کو منہ نہیں دکھا سکتے۔

سچ یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی طرف سے خبر رسی کی بہت کوشش کی لیکن قدرت ہی کو ہماری خجالت منظور ہے۔ کل کی لیجیے۔ ہم نے کمرے میں بند ہو کر بسکٹ کھا لیے اور پانی پی لیا اور اوپر سے نمک سلیمانی پھانک لیا۔ کیونکہ ویسے یہ خوراک نقصان کرتی ہے۔ اندر جا کر پھول جاتی ہے۔ شام کو البتّہ پیٹ نے کہ بڑا بد کار ہے کھانا مانگا۔ کھانے کے معاملے میں ہم نے مدّت سے ترکِ حیوانات کر رکھا ہے۔ بیف یعنی بڑا گوشت ہم سے کھایا نہیں جاتا۔ برلن میں ایک روز بیف اسٹیک لے لیا تھا۔ کھانے

اور پچانے کی منزل ہی نہیں آئی۔ ہماری چھُری سے کٹا تک نہیں۔ ہمارا خیال ہے اصلی بیف نہیں تھا۔ نائیلون وغیرہ کا بنا ہوا تھا۔ خیر ہم نے چوم کر چھوڑ دیا اور اِدھر اُدھر سے آلو کھا لیے۔ لندن میں ہم لیمب یعنی بھیڑ کے بچّے کا گوشت رغبت سے کھاتے تھے۔ حلال حرام کی بحث اخبار میں چھِڑی تو اس سے بھی گئے۔ معرّیٰ کے متعلّق ہم نے اور علامہ اقبال نے سُنا تھا کہ گوشت نہ کھاتا تھا۔ پھل پھُول پر گزر اوقات کرتا تھا۔ ایک روز کسی نے اسے بھونا ہوا تیتر بھیجا تو بجائے اس کے کہ چُپکے سے کھا لیتا، فلسفہ چھانٹنا شروع کر دیا کہ جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ ہمارے معرّیٰ بننے کی راہ میں کئی چیزیں حائل رہیں۔ پھل پھُول بھی یہاں کُچھ سستے نہیں ہیں اور کوئی شخص محبّت سے ہمیں بھونا ہوا تیتر بھیجے تو ہم سے اِنکار نہیں ہو سکتا۔ اِنکار کیا معنی، یہاں ہم کوئی چیز کھاتے ہیں تو وہ تیتر کا ہم نسل مُرغ ہی ہے۔ بھُنا ہوا مُرغ، بلکہ بھُنے ہوئے مُرغ کی ایک ٹانگ۔ سو کبھی یہ پانچ روپے کی آتی ہے۔ کبھی سات روپے کی۔ بون میں ہرٹی کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے تو ایک بار ڈھائی مارک کی بھی مل گئی تھی، لیکن پھر اس کا نرخ بالا ہی ہوتا گیا۔ جنیوا آکر پہلے روز ہم نے ساڑھے پانچ فرانک یعنی ساڑھے پانچ روپے کی لی دوسرے روز ایک جگہ ساڑھے چھ کی ملی۔

لیکن ذکر ہم کل کا کر رہے تھے کہ شام کو پیٹ نے ہمیں مجبور کیا کہ کھول بٹوا۔ کھلا ہمیں کھانا۔ ہم نے پچکارا کہ میاں ٹھہر۔۔۔ کوئی ہوٹل دیکھتے ہیں جس میں عام قسم کے آدمی بیٹھے ہوں۔ کیا کھائے گا؟ سینڈوچ کھلائیں؟ پنیر کے سینڈوچ بڑے اچھے ہوتے ہیں لیکن پیٹ کی وہی رٹ۔ مُرغ کی ایک ٹانگ۔

آخر ہم جی کڑا کر کے ایک ریستوران میں گھُس گئے اور کہا ''کھانا کھائیں گے ہم'' بیرا بہت مؤدب اور قاعدے کا تھا۔ ایک کمرے میں ہمیں لے گیا اور بولا ''کیا پئیں گے۔'' ہم نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔''

''سوپ، کیا لاؤں۔''

ہم نے کہا۔ ''سوپ ووپ نہیں چاہیے۔ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں۔''

''کوئی اشتہا افزا چیز حاضر کروں۔''

ہم نے پھر کہا۔ ''کچھ نہیں، ہمارا پہلے ہی بھوک سے دم نکلا جارہا ہے اور ہاں شکّر ہمیں منع ہے۔ لہٰذا بعد میں میٹھا لانے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ ہاں کافی پی لیں گے۔''

''تو پھر کھائیں گے کیا آپ؟''

”مُرغ کی ایک ٹانگ“

بیرے نے بس ایک چھری کانٹا ہماری میز پر رہنے دیا باقی سارے اُٹھا لیے۔

تھوڑی دیر بعد آیا۔ ایک چولھا قسم کی چیز لایا جس کے اندر موم بتّی جل رہی تھی۔ زیادہ تکلّف کے ہوٹل میں کھانا گرم رکھنے کے لیے اسی قسم کے چونچلے ہوتے ہیں۔ اب ہمارا ماتھا ٹھنکا۔

وہ تو اندر گیا۔ ہم نے بٹوا نکال کر رقم گنی۔ خاصے روپے تھے اطمینان ہو گیا۔ پہلے وہ پانی کا پیالہ لایا جس میں لیموں کی قاش پڑی تھی۔

ہم نے اسے ایک طرف کھسکا دیا۔

پھر وہ سلاد کا پیالہ لایا۔ ہم نے اسے سونگھا۔ شاید زیتون کا تیل یا ایسی ہی کوئی چیز سلاد میں تھی۔ ہم نے اسے بھی پرے کھسکا دیا۔

آخر میں وہ جرمِ ضعیفی کی سزا یعنی مُرغ کا پارچہ لایا۔ پلیٹ کو چولھے پر رکھا اس پارچے میں سے آدھا نہایت ادب سے کاٹا اور ہماری پلیٹ میں رکھا۔ ہم نے کہا ”مرسی“ یعنی شکریہ۔ اب جاؤ۔ ہم خود ہی کھالیں گے۔

کھانا کھایا اور کافی پی۔ بل آیا ساڑھے بارہ فرانک کا۔ اس پر ۱۵ فیصدی سروس چارج، سوا چودہ سے کچھ زیادہ۔ اب کیا پون فرانک ٹپ بھی نہ دیتے۔

ہم نے بڑی بے اعتنائی سے پندرہ فرانک اس کے حوالے کیے۔ کوٹ سنبھالا اور باہر۔۔۔

لندن میں پھر اچھا تھا۔ مسز واٹسن کے بھٹیار خانے میں رہ کر ہم نے کچھ پاؤنڈ بچا لیے تھے جو جرمنی میں خرچ ہوئے۔ جنیوا میں ایک صاحب وطنِ عزیز کے مل گئے۔ ہماری ہی طرح کام کے بہانے دھیل میں یورپ کی سیر کر رہے تھے۔ کفایت شعاری کی خوبیوں پر بات چھِڑ گئی ہم نے بھی اسراف کرنے والوں کی جی کھول کر بُرائی کی اور کہا۔ دیکھیے لندن میں ہم نے اپنے وظیفے میں سے بچا کر یہ سوٹ خریدا ہے، کیسا ہے؟

وہ کچھ متاثر نہ ہوئے۔

اب ہم نے کہا ”یہ اوور کوٹ بھی ہم نے اپنی بچت میں سے لیا ہے۔ دس پاؤنڈ کا آیا تھا۔“

ان پر پھر بھی کُچھ خاص اثر نہ ہوا۔ ہم نے نائیلون کی دو قمیصیں، جرابوں کے جوڑے اور متعدّد ٹائیاں خریدی تھیں۔ وہ بھی دِکھائیں کیونکہ ہم اس وقت داد طلبی کے موڈ میں تھے۔

اس کا کماحقہ، ردِّ عمل نہ ہوا تو ہم نے سوٹ کیس کھول کر چینی مٹّی کی نیلی پلیٹ نکالی اور کہا۔ "ڈلفٹ کی ہے، اور یہ دیکھو اس پر پون چکی بھی بنی ہوئی ہے۔"

بڑی مشکل سے بولے "ہاں ٹھیک ہے۔" اب ہم نے انہیں پون چکی کا ایک اور نمونہ دکھایا۔ یہ بھی ہم نے لیڈن سے بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔ آرٹ کا البم۔ پرانی تصویروں کے کچھ پرنٹ پچھلی صدی کے کچھ میگزین اور شاعری کی کچھ کتابیں بھی دکھائیں۔ یہ سب ہم نے انگلستان اور فرانس اور جرمنی سے فراہم کی تھیں۔

بولے۔ "کیمرہ کونسا لیا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "ہمیں کیمرے وغیرہ پسند نہیں۔ مصوّری اور تصویر کشی وغیرہ ہمارے شوق نہیں ہیں۔ ماہ رُخوں کے لیے ہم نے شاعری سیکھ لی ہے۔ اسی سے کام نکل آتا ہے۔"

”ٹیپ ریکارڈ؟ ٹیلی وژن؟ ٹرانزسٹر؟“

ہم نے انہیں بتایا کہ گانے بجانے کے آلات بھی ہمارے دائرے سے خارج ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ مرفی ریڈیو لیا تھا۔ بڑی خوش اسلوبی سے کام دے رہا ہے۔

اس پر وہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ بولے۔: ”ٹیلی وژن سیٹ تو میں نے بُک کرا دیا ہے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر ہے۔“

”اور یہ کیا ہے؟“ ہم نے کہا

بولے۔ ”یہ الیکٹرک ٹوسٹر ہے!“

ہم نے کہا۔ ”الیکٹرک ٹوسٹر کی بات نہیں۔ اس کے پاس جو ہے؟“

بولے۔ ”پریشر کُکر ہے۔ کبھی دیکھا نہیں تم نے؟“

ہم نے کہا۔ ”ان چیزوں کی بجائے تم فریج لے لیتے تو اچھا تھا۔ گرمیوں میں کام آتا ہے۔ پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔“

HANDLE
WITH
UP
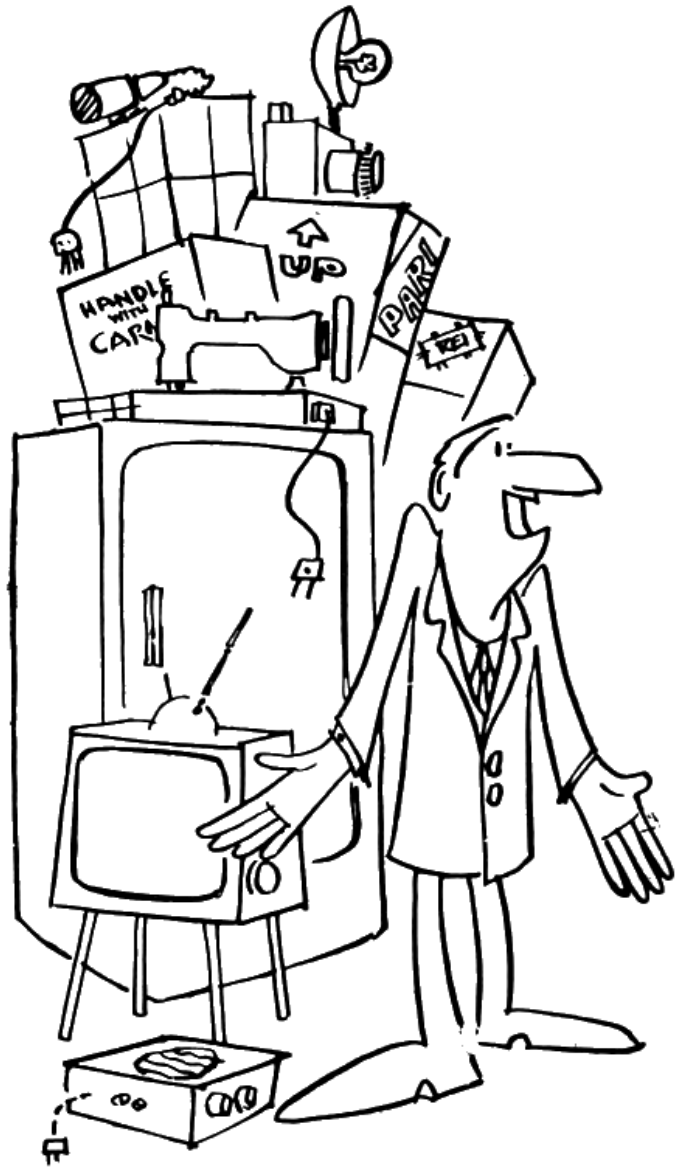
بولے۔ ”ہاں لیا ہے وہ کمپنی نے سیدھا بھجوا دیا ہے۔“

”اور کیا لیا ہے؟“ اب ہمارا مورال کچھ گرنے لگا تھا۔ بولے۔ ”بس اور کچھ نہیں لیا۔ ہاں فیٹ کار کے پیسے لندن میں جمع کرا دیے ہیں۔ اٹلی سے جہاز میں بار ہو گی۔“

ہم نے کہا۔ ”تم نے پون چکی کے نمونے نہیں خریدے کیا؟ ہالینڈ کی خاص چیز ہے؟“

بولے۔ ”فلپس کا کارخانہ بھی تو ہالینڈ ہی میں ہے۔ نیچے جو ڈبّہ رکھا ہے اس میں فلپس کا ٹرانزسٹر ہے۔“

تب ہم نے پوچھا۔ ”کھاتے کیا تھے آپ؟“

بولے۔ ”ڈبل روٹی کھاتا تھا ایک ڈبل روٹی، ایک ڈبّہ پنیر کا، مُجھ اکیلی جان کے لیے دو تین دِن کو کافی تھا۔“

”رہتے تو ہوٹل میں ہو گے۔“

بولے ”یہ کمرہ الگ لینے کی عیاشی نہیں کرتا تھا۔ لندن کے مضافات میں ایک کمرہ لے کر ہم تین آدمی رہتے تھے۔ اپنی اپنی چارپائی کے پیسے دیتے تھے۔ اب یہاں

ایمسٹرڈم میں سنگل کمرہ لینا پڑا ہے۔ کہو تو تمہارے ساتھ آ جاؤں۔ آدھا، آدھا دونوں دے دیں گے۔"

ہم نے غور کر کے کہا۔ "تمہیں تکلیف ہو گی۔ کیونکہ ہم رات کو خرّاٹے لیتے ہیں۔ ورنہ انکار نہیں تھا۔"

اب ہم نے عزم بالجزم کیا کہ گزشتہ را صلوات۔ اب ہم بھی کفایت کریں گے۔ جنیوا آنے پر ہمیں جو گزارہ ملا اس میں سے ہم نے سو فرانک پہلے ہی دِن سوئٹزر لینڈ کے ایک مشہور بنک میں جمع کرا دیے اور طے کیا کہ ان کو ہم اب نہیں نکالیں گے۔ سوئٹزر لینڈ کے بنک دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے کاروبار کرتے ہیں۔ راز داری کا اصول ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور سیاست دان اور ملک التجّار اِن بنکوں میں پیسے جمع کرا دیتے ہیں کہ کل کلاں تخت کا تختہ ہوا تو سوئٹزر لینڈ میں جا رہیں گے یا اس جمع جتھا کے بل پر کہیں اور بیٹھ کے عیش کریں گے اور بقیہ عمر یاد خدا میں گزاریں گے۔

ہم نے بھی یہ پیسے جمع کراتے وقت خزانچی سے کہہ دیا کہ میاں اس رقم کا کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے۔ ہمارے ملک کا قانون بہت سخت ہے کوئی شخص باہر روپیہ

نہیں رکھ سکتا۔

اس نے کہا" اطمینان رکھیے۔ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ آپ کے ملک کے اور بھی بہت سے روسا اور سیاست دانوں اور سابق وزیروں کے اکاؤنٹ ہمارے یہاں ہیں۔ بعضے تو سودے کر کے اپنا کمیشن سیدھا یہاں جمع کرا دیتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "تم لوگوں کا اصول راز داری ہے اس لیے سب کے نام تو نہیں پوچھتے۔ چند ایک کے بتادو ہم اپنے کالم میں تو شاید لکھ دیں۔ ویسے کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

لیکن وہ شخص تیّار نہ ہوا۔ اصل میں ہم بڑی ہوشیاری اور ترکیب سے اس کا امتحان کر رہے تھے۔ کسی کا نام وہ ہمیں بتا دیتا تو اس کا امکان تھا کہ ہمارا بھی کسی کو بتا دیتا۔ اور یوں سوئٹزرلینڈ کے سب سے بڑے اور با اعتماد بینک میں ہمارا اکاؤنٹ کھُل گیا۔ ہم نے خفیہ اکاؤنٹ نمبر بھی لے لیا اور حساب کرنا شروع کیا کہ خاصی شرح سود ہے۔ دس سال میں ہماری رقم دُگنی ہو جائے گی۔ یعنی دو سو فرانک اور پچاس سال میں تو یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ ہم نے حساب پھیلانا چاہا لیکن ہم سے نہ ہوا۔ اتنا بڑا حساب تو کمپیوٹر ہی کر سکتا ہے۔

افسوس کہ یہ پھول دو دِن بہار جانفزا کھا کر مرجھا گئے۔ آج صُبح ہم نے یہ پیسے نکلوا

لیے۔ بس کچھ ایسی ہی بات تھی۔ ہوٹل کا بِل دینا پڑ گیا۔

اس کے علاوہ حتیٰ الوسع اپنے ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا بھی ہمیں پسند نہیں۔

ہم جنیوا سے چل دیئے

اگر ہم جنیوا سے برن نہ آتے، جیسا کہ پروگرام نہیں تھا۔ ہمارے پاس ہوائی جہاز کا ٹکٹ جنیوا تا زیورخ موجود ہے تو سوئٹزرلینڈ کے متعلّق ہماری رائے اسی قسم کی رہتی جیسی مخدرمنا حفیظ جالندھری نے ایک نظم میں جنّت کے متعلّق ظاہر کی ہے کہ:

کیا ہے جنّت، چند حوریں، ایک چمن دو ندیاں

ہم نے ایک بار کہا بھی کہ آپ نے محض اس لیے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا بُرائی کر دی ہے۔ ورنہ ہمارے خیال میں تو اچھی خاصی جگہ ہے۔ جنّت ہمیں کوئی بھیجے گا نہیں ورنہ ہمیں تو کوئی اعتراض نہ ہو۔ فرمانے لگے کیا پتہ میاں وہاں جانا ہی پڑ جائے۔ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر تو ہوتا نہیں، کراماً کاتبین اپنے روزناچوں میں جو جی چاہیے لکھ دیں، جو جی چاہے حذف کر دیں۔

جنیوا میں کسی نے مشورہ دیا کہ حضرت! ہوائی جہاز سے سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا جاتا اور پھر جتنی دیر میں تمہاری بس ہوائی اڈّے تک پہنچے گی یا ہوائی اڈّے سے دوسرے شہر کے ٹرمینل تک پہنچائے گی، اُتنی دیر میں تم سوئٹزرلینڈ کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک پہنچ جاؤ گے اور پھر برن نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا۔ ہم نے کہا اچھی بات ہے۔ ہم نے ہوٹل ساں ساں ساں کو خیر باد کہی اور پون بجے کی ایکسپریس پر آن سوار ہوئے۔ شہر سے نکلتے ہی منظر بدل گیا۔ داہنے ہاتھ جھیل کبھی چھپ جاتی تھی کبھی دِکھائی دے جاتی تھی۔ بائیں طرف چراگاہوں اور سبزہ زاروں کے سلسلے شروع ہو گئے اور ان میں فاصلے فاصلے سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے پرانی وضع کے کاٹیج۔ پھر لوزان آیا۔ یہ بھی خوبصورت شہر ہے لیکن ہمیں تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ جچا نہیں۔ اس کا وہ چہرہ جو ہماری طرف کو تھا بس یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح تھا۔ ماڈرن عمارتیں، اشتہاروں کی ریل پیل، ٹریفک کا زور۔ لیکن ان سے گزرے تو وہی سرسبزی و شادابی، کبھی گھاٹی، کبھی وادی، کبھی جنگل، مغرب میں گھاٹی کی دیوار ہے تو مشرق میں نشیب کا سلسلہ دور جھیل کے پانیوں تک چلا گیا ہے اور اس درمیان میں گاؤں ہیں، کھیت ہیں، مویشیوں کے ریوڑ ہیں۔ موسم کچھ گدلا سا تھا لیکن کھُلی دھوپ ہوتی تو منظر کی شادابی شاید ایسی نہ

رہتی۔ خدا جانے کون لوگ ہوں گے جو ان سبزہ زاروں میں رہتے ہوں گے اور پھر ہمیں صحراؤں کا خیال آیا۔ عرب کے صحرا کا، افریقہ کے صحرا کا، اپنے صحرا کا جہاں آدمی پانی کے قطرے اور گھاس کی پتّی کو ترستا ہے اور وہ جگہیں اسی دنیا میں واقع ہیں اور وہ لوگ انہی صحراؤں میں زندگی کے کڑے کوس طے کرتے سوئٹزرلینڈ دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی گائیں اور دوسرے مویشی بھی موٹے مسٹنڈے نظر آئے۔ ہمارے مویشیوں کی طرح بھوکے ننگے نہیں۔ اب ہمارا خیال بھٹکتا ہوا گودان کی طرف گیا۔ پریم چند کی طرف گیا۔ پریم چند کی جنم بھوم کی طرف گیا۔ جہاں کال کے بادل ایک بار پھر منڈلا رہے ہیں۔ ہم جھر جھری لے کر ایک بار پھر سوئٹزرلینڈ میں آ گئے۔ اے آنکھو، یہ سب دیکھ لو۔ جانے پھر کب آنا ہو۔ کبھی آنا ہو کہ نہ ہو۔ پھر سحر ہو نہ ہو کسے معلوم؟ اور جب ہماری آنکھیں اس حسن اور سبزے کے نظارے سے لبالب بھر گئیں اور چھلک گئیں تو اپنے دوست محبوب خزاں کا مصرع بار بار زبان پر آیا۔ اتنا حسن کیا کرو گے؟ اتنا حسن کیا کرو گے؟

برن سے پہلے گاڑی کچھ دیر کو فرائی برگ اسٹیشن پر رُکی۔ عین لائن کنارے ایک قبرستان تھا۔ دور دور تک قبروں اور صلیبوں کا سلسلہ لیکن سب پھولوں سے ڈھانپی ہوئی، سبزہ نورستہ ان ابدی آرام گاہوں کی نگہبانی کرتا ہوا۔ قلم کی کیا مجال جو اس

حسن کے سحر حلال کو احاطے میں لائے۔

برن میں ہوٹل میٹروپول پہنچ کر ہم نے کاؤنٹر پر کہا۔ ”جلدی سے ہمیں کمرہ دیجیے پھر ہمیں سیر کو نکلنا ہے۔“

کاؤنٹر پر ایک لڑکی تھی۔ بولی۔ ”آپ مسٹر سلنگا ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”نہیں۔ ہم مسٹر سلنگا نہیں ہیں۔ مسٹر انشا ہیں جنیوا سے انٹر نیشنل بیورو آف ایجوکیشن نے فون کر کے ہمارے لیے کمرہ ریزرو کروایا تھا پس اب دیر مت کرو۔“

”مسٹر سوتے نے فون کیا تھا۔“

ہم نے کہا۔ ”مسٹر سوتے کو ہم نہیں جانتے، نہ مسٹر جاگتے کو جانتے ہیں۔ وہاں تو مس کارڈیل تھیں۔ ہو سکتا ہے ان کے دفتر میں مسٹر سوتے کوئی صاحب ہوں۔“

بولیں۔ ”اگر آپ مسٹر سلنگا ہیں اور مسٹر سوتے کے فرستادہ ہیں تو چشمِ ما روشن دِل ما شاد۔ کمرہ حاضر ہے۔“

”ورنہ۔۔۔!“

"ورنہ نہیں۔۔۔ ہمارے پاس ایک ہی سنگل کمرہ ہے۔"

پہلے تو جی میں آئی کہہ دیں کہ ہاں ہمیں مسٹر سلنگا ہیں۔ سلنگا ہماری عرفیت ہے لیکن سچ مچ کے مسٹر سلنگا آ گئے تو ناحق فضیحتہ ہو گا۔ ہم نے کہا۔ ہم نہیں جانتے آپ جنیوا فون کیجیے۔ یہ نمبر ہے ان سے تصدیق کیجیے۔ جنہوں نے کمرہ ریزرو کروایا تھا۔

انہوں نے فون کیا اور فون کرتی رہیں۔ پہلے نہ جانے کون فون پر آیا پھر کوئی اور آیا۔ پھر کسی اور کو بھیجا۔ آخر کھلا کہ وہ لوگ ہماری ریزرویشن کرانے کا ارادہ تو رکھتے تھے لیکن بس بھول گئے۔

ہم نے کہا "خیر! بندہ بشر ہے لیکن ہمیں کمرہ چاہیے۔"

بولیں: "ڈبل روم ہے۔ سنگل تو ہے نہیں۔"

ہم نے کہا۔ "ٹھیک ہے ڈبل روم ہی دیجیے۔"

ہوٹل ایسا پُر رعب اور شان و شوکت والا ہے کہ ہم نے بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ آج کی رات تو سوئیں گے مزے کریں گے۔ کل بِل دیتے وقت دیکھا جائے گا۔ اصل میں ہم البرز ہوٹل اور ساں ساں ساں ہوٹل قسم کے ٹھکانوں میں رہتے تنگ آ گئے

ہیں۔ اب یہ اتنا کشادہ کمرہ ہے جس میں ہم پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ ہوٹل ساں ساں میں تورات کو جونہی دامان خیال یار کو پکڑنے کے لیے کروٹ بدلی، زمین پر آرہے۔ ہم نے خود ہی بیورووالوں سے کہا تھا کہ اب کے ہمارے لیے کوئی فرسٹ کلاس ہوٹل مقرّر کیجیے گا۔ بولے۔ ”میٹروپول اچھا ہے لیکن مہنگا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ہم کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ اللہ ہمارے اسٹیٹس کا خیال کرو۔“

فرمایا ”تو ہلٹن وغیرہ میں آپ کے لیے کمرہ مع غسل خانہ ریزرو کرادیں۔“

اب ہم کچھ ڈر گئے۔ ہم نے کہا۔ ”ہلٹن وغیرہ سے ہمیں وحشت ہوتی ہے شور بہت رہتا ہے اور غسل خانہ کی حاجت نہیں۔ آج کل سردیاں ہیں ہمیں حکیم نے نہانے سے منع کر رکھا ہے اور فرسٹ کلاس کا مطلب ہے ہمارے حساب سے فسٹ کلاس۔“

اس پر ان لوگوں نے میٹروپول کر دیا، یعنی کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ سنگل روم ہوگا۔ آخر کہاں تک مہنگا ہوگا۔ ڈبل روم کی ہم نے سوچی ہی نہ تھی۔

لیکن ہمارے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ ایسے موقع پر ہم آدھی رات تک ایک بستر پر سوتے ہیں۔ باقی رات دوسرے پر لوٹ لگاتے ہیں۔ ناشتہ غالباً ایک ہی ملے گا۔ کم ہوا تو اپنے غیر حاضر پارٹنر کا بھی منگا کر کھائیں گے۔ کیوں کہ ہوٹل ساں ساں والوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ بس ایک چھوٹی سی پاپا نما روٹی دیتے تھے۔ مکّھن بھی بقدر اشکِ بلبل، ذرا سا مارملیڈ۔ اب ہمیں مسز واٹسن یاد آئیں کہ دو انڈے دیتی تھیں۔ بے شمار توسوں اور مکّھن مربّے کے علاوہ کارن فلیک اور دودھ بھی پھلوں کے رس کا گلاس بھی۔ وہاں سے گرے تو جرمنی میں باقی ٹھیک ہے ہاں انڈہ اپنے پلّے سے کھایا۔ ایمسٹرڈم میں مکّھن اور پنیر اور قسما قسم کی میٹھی پھیکی مسالے دار روٹیوں کا ڈھیر۔ جنیوا میں کئی بار جی چاہا کہ ساتھ والے کی پلیٹ سے نظر بچا کر روٹی اُٹھا لیں۔ کسی شہر سے رُخصت کی شب ہمیشہ ہم پر بڑا اثر چھوڑتی ہے۔ ایمسٹرڈم سے ہمیں علی الصُبح چلنا تھا اور چھ بجے اُٹھنا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی پانچ بجے سامنے سڑک پر گانے کی آواز آئی تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھتریاں تانے ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھی الاپ کر رہی تھیں۔

I Love to Kiss you.

آواز میں ابلتی ہوئی جوانی اور بے فکری۔ جانے کون لوگ ہوں گے کہاں کے ہوں

گے۔ پھر وہ ناچنے لگے ہم نے اپنا دریچہ کھولا۔ مدھم روشنی کی تو وہ لوگ متوجّہ ہوئے۔ اے مسافر کہاں کے رہنے والو ہو تم۔ ہم نے جی میں تو کہا کہ تم جہاں کے ہو وہاں کے ہم بھی ہیں۔ لیکن یوں خاموش رہے۔ اب وہ بولے کونسی زبان بولتے ہو۔ اب پھر ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ دِل کی زبان بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ تم سے آن ملیں۔ کیوں نہیں تم لوگ یہاں آجاتے، اس گرم بستر میں آرام کرتے، اس بے خانمانی سے چھٹکارا پاتے۔ کوئی جواب نہ پا کر ان لوگوں نے اپنی حدی کو تیز تیز اور اپنی نوا کو بلند کر دیا۔ دِل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں۔ اے بے قرار روحو! ہم تمہارے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں۔ اب ہم نے دریچہ بند کر لیا کمرے کا بھی، دِل کا بھی، آنکھوں کا بھی، جانے کب وہ لوگ برستے پانی میں کہاں رُخصت ہو گئے۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو سنّاٹا تھا۔

جنیوا کی آخری رات ہم نے دریا پار سنہری کلسوں والے روسی گرجے کا چکّر کاٹ کر یونیورسٹی کے باغ میں سے ہوتے ہوئے نئے چوک سے پردمی نیڈڈی لاترلی کی سیر گاہ میں ٹھیکی لی۔ گھاٹی چڑھ کر ان ٹیڑھی میڑھی تنگ و نیم تاریک جگہوں میں گم ہو گئے۔ جِن میں اب بھی سولہویں اور سترھویں صدی کی بُو باس تھی۔ سب سے پہلے کوچہ تیر اسے آیا۔ وہ حویلی جس میں ۱۸۰۰ء میں نپولین اعظم مادام ساسیوں کے

ہاں مہمان اُترا تھا۔ یہ چند گز کا کوچہ آگے ایک اور ایسے ہی تنگ کوچہ میں مل گیا۔ دہنے ہاتھ چڑھائی تھی اور یہی گراؤنڈ رو تھی۔ ۲۵ کے مکان کے سامنے جا کر ہم رک گئے یہاں ملٹن اٹلی سے واپسی پر پاسچیور دیو دارتی سے آ کے ملا تھا اور آگے تھوڑی دور چل کر دہنے ہاتھ کا یہ اونچا مکان دیکھیے۔ نمبر ۴۰ یہاں ۱۷۷۲ء میں روسو پیدا ہوا تھا۔ اب لوٹیے اور نشیب کی طرف آیئے جہاں گرانڈ رو ختم ہوتی ہے۔ رودی لا سیتے شروع ہوتی ہے۔ نمبر ۲۰ پر یہ اونچی حویلی دیکھ رہے ہیں آپ؟ کبھی یہ شاتوبریاں کی قیام گاہ تھی۔ اچھا اے رفتگاں کی روحو۔ اس مسافر کا سلام لیکن جاتے ہوئے ایک نظر اور ولی پطرس کے کیتھیڈرل پر، اس کی پہلی اینٹ ۱۱۵۰ء میں رکھی گئی تھی۔ عمارتیں کھڑی ہیں۔ ان جگہوں میں پیدا ہونے والے جوان ہونے والے۔ گھومنے والے ہی نہیں رہے، ہر چیز کو دوام ہے سوائے انسان کے۔ در و دیوار موجود، اُن کے بنانے والے مٹّی ہو چکے۔ اب چل اے سیلانی دریا پار کر اور کل کے لیے رختِ سفر درست کر۔

برن کی سحر بھری رات

ہم نے پیرس کے گرجوں اور استنبول کی مسجدوں کو تحیّر سے دیکھا ہے نوٹری ڈیم، کولون کا کلیسا، آیا صوفیہ کا گنبد، مسجد سلطان فاتح۔ خدا نے دکھایا تو اور بہت کچھ دیکھنا باقی ہے لیکن قرونِ وسطیٰ کے جس آسیبی اور الف لیلوی ماحول میں آج برن کی گلیوں میں اس تنہا نے گشت کی ہے اس کا بیان محال ہے۔ آج بہت دِن بعد چاند نظر آیا، جانے کس تاریخ کا ہے۔ برن کے بازاروں کے پرانے محرابی راستوں میں جانے کہاں سے چلے کہاں جا نکلے۔ کلاک ٹاور سے آگے گزر کر سڑک کا نام پڑھا۔ اچھا تو یہ کرام گاسے ہے۔ یہاں مارکیٹ گاسے کی سی چھل پہل نہیں ہے۔ شب اُترنے لگی ہے لوگ رُخصت ہونے لگے ہیں۔ کاریں موٹریں بھی اِکّادُکّا گزر رہی ہیں۔ یہ بھی پکّی اینٹوں کا راستہ ہے۔ عین سڑک بیچ فوّارے کا مینار آ گیا جس پر کوئی پیکر بھی بنا ہوا ہے اب سڑک کی اُترائی شروع ہو گئی ہے۔ دیکھیے کہاں تک جاتی ہے۔ دو رویہ

محرابیں ہی محرابیں۔ دونوں طرف چیزیں بیچنے والوں کی دُکانیں کہیں کوئی چائے

برن کی جنکرن گاسے

خانہ بھی ہے یا بیر کا پیپہ پڑا ہے۔ بر آمدہ اُونچا ہے تو سڑک پر اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنادی ہیں اور نیچے۔۔۔ اور نیچے، لیجیے پُل کا خاکہ نظر آنے لگا۔ اُفّوہ! نیچے دریا ہے۔ دریا کے ساتھ سڑک ہے۔ چھ چھ سات سات منزل کے مکان ہیں جن کی چھتیں پھر بھی پل کے برابر نہیں پہنچتیں۔ اس اونچائی سے کاریں اور چلتے پھرتے لوگ بھی چھوٹے محسوس ہوتے ہیں۔ اب پُل کا سِرا آگیا، لوٹنا چاہیے۔ واپس کرام گاسے۔ لیکن نہیں۔ یہ بائیں ہاتھ کی ویران گلی دِل کو کھینچ رہی ہے۔ جنکرن گاسے۔ یہاں تو قدامت کی چھاپ کُچھ اور گہری ہے۔ موٹے آثار کی چوڑی اور اونچی گول محرابیں۔ وہی کہ اصفہان کے مسقف بازار میں ملتی ہیں لیکن ان کی نسبت پست، تین صدی پہلے کی تو ہوں گی۔ سنّاٹا کسی پراسرار فلم کا سا سین ہے۔ روشنی بھی کم کم کہیں کہیں۔ کوئی دُکان کھلی بھی ہے لیکن گاہکوں کے لیے نہیں دکاندار بیٹھا دِن بھر کی کمائی کا حساب جوڑ رہا ہے۔ لیمپوں کے سائے عجب عجب شکلیں بنا رہے ہیں، لیجیے کھُلا احاطہ آگیا اور پندرہویں صدی کے مشہور گرجا نائیدگ کرک کی پشت۔۔۔

یہاں سے ایک تنگ سیڑھیوں کا سلسلہ نیچے کہیں اُتر گیا تھا۔ ان نیم تاریک سیڑھیوں میں بے سمجھے اُترنا ہے خطرناک، جانے کہاں پہنچا دیں لیکن دیکھا جائے۔ ۵۰ سیڑھیاں، پھر موڑ، پھر ۴۰ سیڑھیاں، پھر موڑ، اگلے موڑ کے پیچھے سے قدموں

کی چاپ آ رہی ہے۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے ہم جیسا خدائی خوار۔ گلا گھونٹنے والا نہیں یہ تو کوئی طالب علم سا لگتا ہے بغل میں کتابیں ہیں۔۔۔ نیچے کنارِ دریا کی آبادی سے آ رہا ہو گا۔ اگلا موڑ لیکن یہ تو لامتناہی سلسلہ ہے اب واپس اب قدموں کی چاپ اُوپر سے آنی شروع ہو گئی۔ نیچے کے راستے میں اب کوئی نہیں ہے کیونکہ صدیوں پرانی ان بوسیدہ سیڑھیوں پر تھوڑی سی آہٹ بھی بہت گونجتی ہے۔ ہم اس راستے کے اِدھر میں ہوں گے۔ اب اوپر کی چاپ قریب آ رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ ارے یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ ارے لڑکی تو اس ویرانی اور سنّاٹے میں کہاں سے آ گئی۔ کیا تجھے کسی کا ڈر نہیں، نیچے کنارِ دریا پر کس کی کشش تُجھے لے جا رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ خوشبو کا ایک جھونکا پاس سے گذر بھی گیا۔ اوپر گرجا کا احاطہ، احاطے میں پھولوں اور پودوں کی رَوشیں، کونوں پر شش پہلو سُرخ محافظوں کی کوٹھڑیاں، دور احاطے کی دیوار، اس کے ساتھ دو سائے۔ دور باش اے اجنبی، ان کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالنی چاہیے۔ اب ذرا دیوار کی منڈیر پر جھک کر نیچے دیکھو۔ بارِ خدایا۔ کیا منظر ہے، دریا راستے مکان، دریچے، دریچوں میں روشنی، روشنی میں لوگ، اچھے لوگ، بُرے لوگ، شاد لوگ، ناشاد لوگ اپنے آپ میں گُم۔ دوسرے انسانوں کے غموں اور خوشیوں سے بے پروا۔

اور اے گرجا۔ تو جو پانچ سو سال سے سرِبُلند کھڑا ہے۔ تو نے کِس کِس کو سرنگوں دیکھا ہے۔ یہ تیرے ماتھے پر مجسّموں کا جال کیسا ہے۔ اِدھر بخشے جانے والوں کے پیکروں کا ہجوم ہے۔ اُدھر مقہورین اور مغضوبین کا۔ افّوہ گیارہ بج گئے کیا؟ پہلے سُریلی گھنٹوں کا سلسلہ، پھر گھن گرج، اچھا رُخصت، لوگ آئیں گے دیکھیں گے چلے جائیں گے۔ تو یونہی پابہ گل کھڑا گجر بجاتا رہے گا۔ اے عظمت استادہ، ہم فانی ہی سہی لیکن تُجھ سے مجبور نہیں۔ دور دور کی منزلوں میں قدم ماریں گے اور وہاں جا آرام کریں گے۔ جہاں سب آرام کرتے ہیں۔ ہم تیرے شکوہ اور سربلندی پر تحیّر ضرور کریں گے۔ لیکن رشک نہیں، پانچ سو برس تک کوچہ جنکرن گاسے کی اداس محرابوں والی گلی اور دریا کے درمیان بے حس و حرکت کھڑے رہنا ہمیں منظور نہیں۔۔۔ ہرگز منظور نہیں۔

زیورخ تک بُراستہ بٹھنڈہ

یہ عجب اتّفاق ہے کہ جہاں ہم جس ہوٹل میں ٹھہریں آس پاس مرمّت کا کام بہت نکل آتا ہے۔ جنیوا والے ہوٹل کے سامنے سڑک برائے مرمّت بند ہے، کا بورڈ لگا ہوا تھا اور دِن بھر جنیوا کے کے ڈی اے والے خاک اُڑاتے رہتے تھے۔ برن میں ہماری آمد کی اطلاع پاتے ہی ان لوگوں نے ایک بہت اونچی سی کرین ہماری کھڑکی کے سامنے لا کھڑی کی اور شب بھر گڑ گڑ دھڑ دھڑ ہوتی رہی۔ ایمسٹرڈم کے ہوٹل کے ساتھ ہی اُن دِنوں ایک شخص کو اپنا پرانا مکان ڈھا کر نیا بنانے کی سوجھی تھی۔ ایک آدھ جگہ کی تو خیر تھی۔ لیکن ہر جگہ ہر شہر میں اس کا التزام محض اتّفاق کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ مرمّت کے ذکر پر یاد آیا کہ کام تو رفو کا ہمارے دِل میں بھی بہت ہے لیکن کاریگر اس کے پاکستان میں ہیں۔

برن میں دوسری صُبح ہر طرف دُھند ہی دُھند تھی۔ لیکن ہمارے پاؤں میں چکر۔ نو

بجے چل نکلے سب طرف سڑکوں اور موٹروں کی بتّیاں جل رہی تھیں۔

دریائے زیورخ کا ساحل

کلاک ٹاور کے پاس سے نکل کر چن فیلڈ پُل سے دریا پار کیا تو سامنے بُرجوں والا ایک قلعہ نظر آیا اور اس کے سامنے چوک میں مجسّموں کا ایک سلسلہ۔ لیکن ہماری منزل ایک لائبریری تھی۔ لہٰذا حلوتیا اسٹریٹ پکڑی اور ایک دو جگہ بھٹک کر اور پوچھ کر منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں کُچھ ایسا کام نہ تھا بس دیکھنا تھا۔ ہم نے جاتے ہی تعارف کرایا کہ ہم صاحبِ علم آدمی ہیں کوئی مخطوطے وغیرہ ہوں تو دِکھادو۔ معلوم

ہوا کوئی نہیں۔ جرمن زبان کی کتابیں ہیں۔ وہ بھی حوالے کی۔ ہم نے کہا اچھا یہ بات ہے تو سلام علیکم، خدا حافظ۔

لیکن لائبریرین صاحبہ ہمیں یوں سستا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں یونین کیٹلاگ کی تفصیل بتانی شروع کی۔ پھر ریڈنگ روم دِکھایا اور کہا اس میں بیٹھ کر لوگ پڑھتے ہیں پھر وہ خانے دکھائے جن میں انڈکس کارڈ رکھے تھے۔ پھر کہا۔ اوپر چلو۔ قطار در قطار کتابوں کی الماریاں بھی دکھاؤں۔ ہم نے کہا ہم نے سب سمجھ لیا۔ بہت اچھی لائبریری ہے۔ اللہ اس کی عُمر دراز کرے۔

فرمایا۔ میں نے اپنی بات تو ابھی پوری نہیں کی اور پھر انہوں نے اپنی بات پوری کرنی شروع کی۔ یونین کیٹیلاگ۔ یونین کیٹیلاگ۔ یونین کیٹیلاگ۔

گاڑی تو ہماری ایک بجے جاتی تھی لیکن اس سے پہلے ہم وہ عجائب گھر دیکھ لینا چاہتے تھے جو پاس کے چوک میں واقع تھے۔ پھر ہمیں کلاک ٹاور جا کر گھنٹہ بجتے دیکھنا تھا پھر ہمیں وہی کل رات والا پُل پار کر کے ریچھوں کا بھٹ دیکھنا تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ہم نے پھر کہا۔ ہم اس لائبریری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خدا حافظ۔

فرمایا: ”آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے آپ کو جرمن کے پرانے رسالوں کے فائل دکھاؤں۔“

اور یوں ان کے اصرار اور ہمارے انکار میں ایک میوزیم کا تو وقت نہ رہا دوسرے کے لیے ہمارے پاس کلھم سات منٹ بچے۔ خیر ہم لوگ گرد پوش پڑھ کر کتاب پر فاضلانہ ریویو کرنے والے ہیں۔ ان سات منٹ میں برن کے ہسٹری اینڈ آرٹ میوزیم میں رکھی ہوئی چیزوں کی ہسٹری پر عبور حاصل کر کے اور آرٹ کے شاہکاروں کی مین میکھ نکال، دربان سے اپنا اوور کوٹ لے تھینک یو کہہ باہر آ گئے۔ ایک طواف مجسّموں کا بھی کیا۔ اس میوزیم میں ہمارے نزدیک سب سے طرفہ چیز تو اس کی عمارت ہے۔ یہ وہی بُرجوں والا قلعہ تھا جسے ہم نے جاتے ہوئے دیکھا تو نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ یہ ساری جلدی اس بات کی تھی کہ بارہ بجے کلاک ٹاور پہنچ جائیں۔ اس کلاک ٹاور میں جب گھنٹہ پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ریچھوں اور گھڑ سواروں کی ایک قطار گھومتی ہوئی نکلتی ہے اور ڈیوک زارنگن کا بُت دونوں ہاتھوں سے گھڑیال بجاتا ہے۔ یہ طرفہ تماشا دیکھنے کو جو نہ جانے کب سے جاری ہے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ہم نے بھی جب تک یہ نہ دیکھ لیا۔ کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔

اب ہم نے پھر کل رات والا راستہ پکڑا۔ کرم گاسے اور اس سے آگے پرانا پُل اور

گرجا اور پھر ریچھوں کا بھٹ۔ ریچھ اس شہر کا نشان ہے۔ جھنڈے پر ریچھ، مہر پر ریچھ، ڈھال پر ریچھ، کہتے ہیں ڈیوک آف زارنگن نے یہ شہر بسانے کا خیال کیا تو عہد کیا کہ اس کے نواحات میں شکار میں جو جانور سب سے پہلے ہاتھ لگے اس پر شہر کا نام رکھا جائے گا اور وہ جانور ریچھ تھا۔ پُل پار کرنے پر دہنے ہاتھ کو ایک گہرا بھٹ ملے گا جس میں ریچھ رکھے گئے ہیں۔ بلکہ دو بھٹ ہیں جن کے گرداگرد جنگلے ہیں۔ ایک میں بڑے ریچھ دوسرے میں ان کے بچّے۔ یہ ریچھ کے بچّے بڑے کھلنڈرے اور معصوم صورت ہیں۔ لوگ ان کو دیکھنے دور دور سے آتے ہیں۔ کسی کو اوپر کھڑا دیکھتے ہیں تو پچھلے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں سلام کرتے ہیں ناچتے ہیں کہ ابھی انعام ملے گا۔ کوئی اوپر سے گاجریں پھینکے گا۔ زیادہ تر تو بے چاروں کی محنت رائیگاں جاتی ہی دیکھی۔ گاجریں تو ہم بھی نہ لائے تھے سوچا پیسے پھینک دیں خود ہی خرید کر کھالیں گے۔ پھر باز رہے، کہ وطن پہنچ کر ہم بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح ریچھ کا بچّہ پالنے کی کوشش کریں گے۔ برن سے ریل میں بیٹھے تو پھر وہی خوبصورت وادیاں، چراگاہیں، چھوٹے چھوٹے مکان، چرتے ہوئے مویشی، اور جنگل اور پربت دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو، کی تمنّا کرنے والا شاعر اقبال ان راستوں سے کئی بار گزرا۔ کیا عجب انہی مرغزاروں اور کہساروں نے اس سے یہ نظم لکھوائی

ہو۔

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
پانی بھی موج بن کے اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

پربت، نیلا پربت، احمد بشیر، خیال بھٹکتا ہوا کہاں سے کہاں جا نکلا۔

بون کا کلاک ٹاور
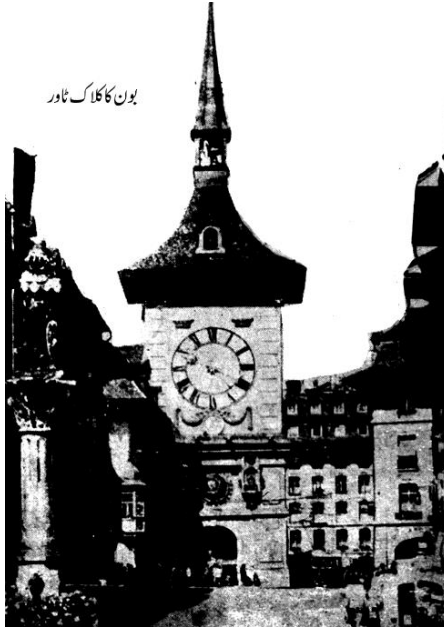
سامنے کی سیٹ پر ایک بڑے میاں بیٹھے تھے۔ پہلے انہوں نے ہم سے جرمن میں گفتگو شروع کی۔ جواب بالصواب نہ ملا تو فرنچ پر آئے۔ ہم نے یہ وار بھی خالی دیا تو شاید اٹالین شروع کی آخر ہم نے اُردو میں کہا، بابا یہ فرنگی بولیاں ہمیں نہ آویں۔

گفتگو ریختے میں ہم سے کر

یہ ہماری زبان ہے پیارے

آخر وہ ایک دوسرے بُڈّھے سے گفتگو میں جٹ گئے جو ان کی بات کا جواب دے کر سو جاتے اور ایک خرّاٹا لے کر پھر اُٹھ جاتے۔ باتیں وہ اس ہمارے سامنے والے بُڈّھے سے کرتے تھے۔ دیکھتے ہمیں رہتے تھے۔ ہم اور تو کیا بولتے۔ ہونکارا بھرنا شروع کر دیا۔۔۔یا۔۔۔یا۔۔۔یعنی ہاں، ہاں، بجا فرمایا۔۔۔بجا فرمایا۔

اب اولٹن آ گیا۔ یہ ایک جنکشن ہے برن اور زیورخ کے درمیان۔ یہاں ہم نے اتر، سامان امانت رکھوا، اپنی منزل کا پتہ پوچھنا شروع کیا۔ سارے پلیٹ فارم پر ایک بھی شخص انگریزی سمجھنے والا نہ ملا۔ اس پر ان لوگوں کو دعویٰ مہذّب ہونے کا ہے۔ کوٹ پتلون پہنے پھرتے ہیں۔ آخر معلومات کے دفتر میں گئے پتہ چلا یہ پُل پار ہی ہماری منزل ہے۔ اس کے باوجود ہم تھوڑی دیر تک بھٹکتے پھرے، کُچھ دانستہ کُچھ

نادانستہ۔

برن سے چلتے میں ہم نے ایک جگہ کافی پی تھی اور ساتھ میٹھے بسکٹ کھا لیے تھے۔ گاڑی ہماری پونے تین بجے پہنچی ہم نے سوچا جن صاحب سے ملنے جا رہے ہیں وہ اس وقت تو خیر کافی پلائیں گے، اس کے ساتھ یہی بسکٹ کیک وغیرہ۔ پھر ہم گفتگو کریں گے۔ تو بے تکلّفی بڑھے گی۔ پھر وہ کہیں گے۔

کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

ہم کہیں گے۔ نہیں نہیں۔ کیا تکلّف ہے، ہم زیورخ پہنچ کر کھا لیں گے۔ وہ کہیں گے۔ واہ! ہم کھانا کھائے بغیر جانے نہ دیں گے۔ بلکہ ہمارا تھیلا اُٹھا کر چھپا لیں گے۔ آخر ہتھیار ڈال دیں گے۔

کہانی والے بہرے کی طرح ہم یہ مکالمے سوچتے ان کے درِ دولت پر پہنچے۔ اُن کی سیکرٹری نے کہا، وہ مصروف ہیں۔ ہم کچھ خفیف سے ہو کر بیٹھ گئے، اور کتابیں دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد ان کی سیکرٹری پھر آئیں اور بولیں، نیچے کی منزل میں کچھ کتابیں اور رکھی ہیں، وہ بھی چل کر دیکھ لیجیے کیونکہ مسٹر فلاں ابھی تک مصروف ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ سے ملیں گے۔ آخر

مسٹر فلاں ملے۔ بڑی اچھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ انہیں کچھ معلومات درکار تھیں جو ہم مہیّا کرتے رہے۔ پھر ہم نے کُچھ پوچھا۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ ہمارے پیٹ کی کھُد بُد ہمیں نڈھال کیے دے رہی تھی لیکن اس اللہ کے بندے نے ہم سے اسکول ہی کی بات کی۔ یہ نہ بتایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی۔

یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ہم نے پونے پانچ ہی بجے اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو آپ جائیں گے۔ یہ کہہ کر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی ہماری سوا چھ بجے چلتی تھی لیکن ہم ڈگ بھرتے اسٹیشن پہنچے۔ باہر ایک مونگ پھلی والا کھڑا تھا۔ اس سے مونگ پھلی لی اور اندر جا کر پوچھا۔ کوئی گاڑی ہے زیورخ، جانے والی اس وقت۔

جواب ملا۔ ”سیدھی گاڑی سوا چھ بجے جائے گی۔“

ہم نے کہا۔ ”سیدھی اُلٹی سے مطلب نہیں۔ ہم فوراً جانے والی گاڑی مانگتا۔“

ٹکٹ بابو نے کہا۔ ”ہاں پانچ بج کر تین منٹ پر ایک گاڑی جاتی ہے۔ لیکن پسنجر ہے۔ بڑا چکّر کاٹ کر برگ کے رستے جائے گی اور قریب قریب اس وقت پہنچے گی۔ جب سوا چھ والی ایکسپریس ٹرین۔“

ہم نے سامان لیا اور پلیٹ فارم ۲ کی طرف ایک جست کی۔ گارڈ نے بھی ہمیں روکنے کی بہت کوشش کی کہ یہ پسنجر ہے اس میں مت بیٹھو لیکن ہم نے مان کر نہ دیا اور کہا یہ رہا زیورخ کا ٹکٹ۔ اگر اور پیسے بنتے ہیں تو بولو۔۔۔ لیکن اولٹن اسٹیشن پر بیٹھ کر انتظار کرنے کی بجائے چلتی گاڑی میں بیٹھے رہنا اچھا۔ اور یوں ہم نے براستہ بٹھنڈہ جانے والی پسنجر ٹرین میں مونگ پھلی ٹھونگتے سفر کیا۔

جو لوگ دیہات یا چھوٹے قصبوں میں بڑھے پلے نہیں وہ برانچ لائنوں اور پسنجر گاڑیوں کا لطف کیا جانیں۔

یہ گاڑی بھی ذرا سا چلتی تھی اور رُک جاتی تھی جیسے جھولے کی بیماری ہو۔ مسافر آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے پہلے اسٹیشن سے بچّے سوار ہوئے دوسرے سے دیہاتیوں کا ایک غول سیٹوں پر پھسکڑے مار کر بیٹھ گیا اور گاجریں کھانے لگے۔ اب ہمیں اپنی گاڑیاں یاد آئیں۔ تہمد باندھے ہوئے بُڈّھے، اُن کے بقچے اور گھڑیاں کسی میں گُڑ، کسی میں چاول، کسی میں تمباکو، کسی نے نئی ہنڈیا، یا ایلومینیم کی پرات خریدی ہے۔ کسی کے پاس نئی چنگیر ہے، تولیے میں نمک کے ڈبّے بندھے ہیں۔ قصبے میں خریداری کرنے آئے تھے۔ جن عورتوں سے سیٹوں پر بیٹھا نہیں گیا۔ وہ فرش پر یا کسی ٹرنک پر بیٹھ گئیں اور بھُنے دانے نکال کر کھانے شروع کیے۔ اب گاڑی

کھڑی ہے اور کھڑی ہے کیونکہ کسی اور لاڈلی گاڑی کو پہلے گزرنا ہے۔ ایک بڑے میاں نے فرش کے کونے کھدروں سے کاغذ اور تنکے جمع کیے، اور فرش پر آگ جلا کر حقّہ بھرا۔ کوئی ہمّت والا دوڑ کر گیا اور پاس کے کھیت سے گنّے اُکھاڑ لایا اور اب گاڑی کے اندر ہی چھلکوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ ابھی ان کی منزل دور ہے۔ کوئی اگلے سگنل پر اُتر جائے گا۔ کوئی اسٹیشن پر، پھر کوئی بہت طُرّہ باز خاں ہوا تو تانگہ ڈھونڈے گا ورنہ سامان کی گٹھڑیاں، ٹرنک، دیگچے، سر پر رکھے، بُقچیاں بغلوں میں داب شام کے جھٹپٹے میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں گاؤں کی راہ لیں گے۔ پھر گاڑی کھڑی ہو گئی اور ہمارے تصوّر کی آنکھ کھُل گئی۔ ہمیں تو یہاں کے دیہاتی اسٹیشنوں پر بس ایک ہی آدمی نظر آیا، اسی نے بھاگ کر کانٹا بدلا۔ اسی نے جھنڈی دی۔ اسی نے لوگوں سے ٹکٹ وصول کیے۔ غالباً اسٹیشن ماسٹر ہو گا۔

ہمارے ہاں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی عادت عام ہے۔ ہم نے بھی بچپن میں کئی بار کیا ہے۔ یہاں کے لوگ بِلا ٹکٹ سفر نہیں کرتے اس کی ایک وجہ تو ان کی طبعی ایمانداری ہے۔

III
PWR

دوسری شاید یہ ہو کہ چیکنگ بڑی سخت ہے۔ اسٹیشن چھوٹا ہو یا بڑا ہو چیکر ضرور آئے گا اور ٹکٹ میں سوراخ کرے گا۔ زیورخ کے قریب پہنچتے پہنچتے پندرہ جگہ کٹ کر ہمارے ٹکٹ کا یہ حال ہوا تھا کہ پڑھا نہ جاتا تھا کہاں کا ہے اور ٹکٹ ہی ہے یا کچھ اور۔ زیورخ سے دو اسٹیشن اِدھر یہ آخری بار کٹا اور ختم ہو گیا اگلے اسٹیشن پر ہم نے چیکر سے کہا کہ وہ جس پر آپ اپنی مشق ناز کرتے تھے وہ تو نہیں رہا۔ اب میری انگلی اس آلے سے کاٹ لیجیے اور زیورخ میں مجھے بغلی دروازے سے نکال دیجیے گا کہیں کوئی بلا ٹکٹ سمجھ کر پکڑ لے۔

جرمنی میں، ہالینڈ میں، سوئٹزر لینڈ میں ٹراموں اور بسوں کا بھی یہی دستور ہے۔ ہماری ٹرام کی طرح بیسیوں دروازے نہیں کہ چیکر ڈال ڈال اور مسافر پات پات اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ بس ایک دروازہ ہے۔ اس میں سے آیئے ٹکٹ بابو کے سامنے سے گزریے وہ ہر ایک کو ٹکٹ دے گا یا چیک کرے گا۔ جب جی چاہے گا۔ ایک بٹن دبا کر سارے دروازے بند کر دے گا۔ جب چاہے گا کھولے گا۔ ایک بڑے میاں بندوق لیے اپنے خربوزوں کے کھیت پر پہرہ دے رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے کہا۔ کیسے ہیں یہاں کے لوگ؟ بڑے میاں بولے بڑے ایماندار ہیں۔ کیا مجال جو میرے خربوزوں کو ہاتھ لگائیں۔

راہ گیر نے کہا یہ بندوق آپ نے کیوں سنبھال رکھی ہے۔ بڑے میاں بولے ان کو ایماندار رکھنے کے لیے۔

اس ایک جواب میں یورپ والوں کی ایمانداری کی فلاسفی آ جاتی ہے پوری نہیں تو بڑی حد تک۔

پھر پیرس

۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء

شامتِ اعمال، ماصورتِ پیرس گرفت

زیورخ سے جہاز اچھا خاصا سیدھا پراگ جاتا تھا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ شامتِ اعمال ماصورتِ پیرس گرفت۔ ہم نے سوچا جلدی کیا ہے۔ اتوار کی صُبح پیرس چلے جائیں۔ ایک شام اور شب وہاں گزاریں، دوستوں سے مل لیں۔ پیر کی دوپہر پراگ روانہ ہو جائیں گے لہٰذا ایک جرمن دوست کو جو پیرس میں رہتے تھے ایکسپریس تار سے مطلع کیا کہ ہم نزولِ اجلال فرما رہے ہیں ہمارے لیے کوئی مناسب ہوٹل مقرّر کر دو اور ہاشم کو پاکستان سفارت خانہ میں فون کر دو کہ رات کو اپنے سالن میں تھوڑا پانی اور ڈال لے اور بازار سے دو روٹیاں فالتو منگا لے۔

سوئٹزر لینڈ کے لیے ہمیں جو جیب خرچ ملا تھا وہ ہفتے کی شام تک سلفہ ہو چکا تھا۔ زیورخ میں ایک شب اور ٹھہرتے تو ساڑھے سترہ فرانک اور جاتے پچھلی بار ہوٹل مالار میں ہم پچیس فرانک دیتے تھے۔ بعد میں تو ایک پاکستانی ناصح مُشفق نے بتایا کہ

+ ۲
۴
۶ =
+ ۷
۱۳ =
+ ۱۴
+ ۲۷ =
۵
۳۲ =
+ ۳۲
۱
= ۳۳
+ ۲
۳۵
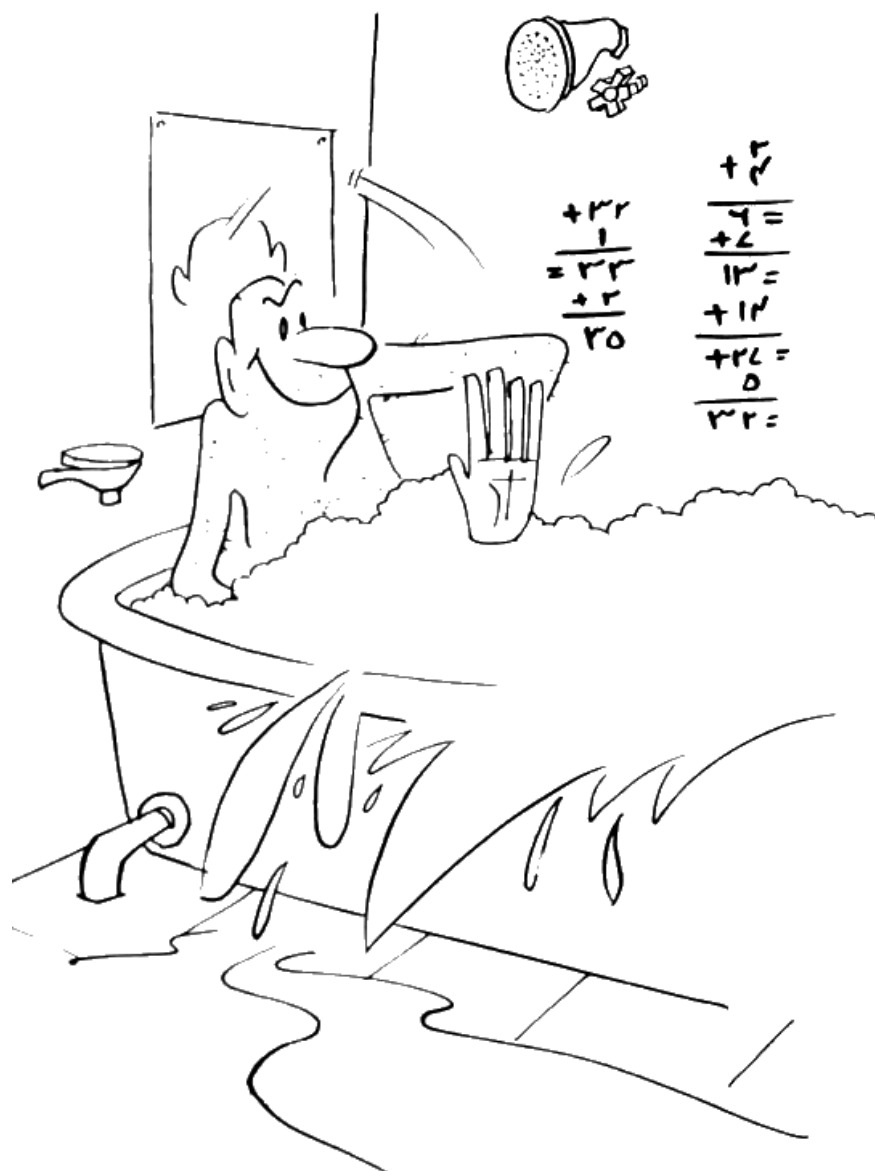
تم تو گھر لٹا رہے ہو۔ میں تو پیرس میں عین یونیسکو کے دفتر کے بغل میں کوچہ گیری بالڈی کے ہوٹل رزاریو میں پندرہ فرانک میں ٹھہرا تھا بس وہاں چلے جانا۔ ایک رات کی تو بات ہے۔ اچھا بھلے مانسوں کا ہوٹل ہے۔ البتّہ انگریزی وہ نہیں جانتے۔ فرنچ بولتے ہیں۔ ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی بہت فرنچ جانتے ہیں، وہ ہم سے زیادہ تھوڑی جانتے ہوں گے۔ احتیاطاً ہم نے اپنے بجٹ میں ہوٹل کے لیے بیس فرانک کی مد نکالی، ایک وقت کا کھانا ہاشم کے ہاں فرض کیا دوسرے وقت کے سینڈوچوں کے لیے پانچ فرانک رکھے، باقی ٹیکسی قُلی بس وغیرہ کے لیے آٹھ دس اور ارادہ یہ تھا کہ پیرس میں اُتر کر ہوٹل میں سامان رکھ سیدھا میوزیم لوور کا رُخ کریں گے۔ ایک تو آرٹ کا شاہکار دیکھ کر ذہن میں کچھ وسعت اور علمیت میں کچھ نِکھار پیدا ہو گا۔ دوسرے پیسے بچیں گے جو بازار میں گھومنے پھرنے کی صورت میں لامحالہ خرچ ہوتے ہیں۔

لیکن وہ جرمن دوست اخلاق کا مارا ہمیں ہوائی اڈّے پر لینے پہنچ گیا۔ بولا ہوٹل تمہارے لیے ٹھیک کر دیا ہے۔ مناسب داموں کا ہے اور یونیسکو سے چنداں دور نہیں لیکن اس وقت تو سامان میری کار میں رکھو۔ میرے گھر چلو دوپہر کا کھانا میرے ہاں۔۔۔ شام کے پانچ بجے تک کے لیے میں فارغ ہوں۔ باتیں کریں گے،

شام کو تمہارے ہوٹل تمہیں چھوڑ آؤں گا اور ہاں میرا گھر ورسائی کے پاس ہے۔ تم نے ورسائی کا محل نہیں دیکھا وہ بھی دِکھا دوں گا۔

ہم نے کہا۔ ”ہمارا عزم تو لوور کا تھا۔“

بولے۔ ”لوور، رات کو دیکھ لینا۔“

ہم نے کہا۔ ”رات کو کھلا رہتا ہے۔“

بولے: ”ہاں۔ رات کو تو نہیں کھلا رہتا۔“

یہ صاحب پاکستان میں رہ چکے تھے۔ اپنے گھر میں انہوں نے پاکستان کے پیالے، بدھنے، توے، پراتیں، ایک دوبے ڈول سی ڈھولکیاں، کان جھڑی سارنگیاں اور اونٹ کی کھال کا ایک لیمپ سجا رکھا تھا جس کی کوئی کَل سیدھی نہ تھی۔ بڑے فخر سے دِکھاتے رہے۔ ایک کُتّا بھی وہ پاکستان سے اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کا نام کراچی خاں رکھا تھا اور اس سے اُردُو بولتے تھے (بہت اچھا۔ گرم پانی شکریہ چائے لاؤ وغیرہ) اس سے انہوں نے ہمارا تعارف کرایا۔ ہمارے ہاتھ چٹوائے، ہماری پتلون چٹوائی، ہمارا تھیلا چٹوایا۔ ہم کُتّوں کو مُنہ نہیں لگاتے۔ مُنہ تو کیا ہاتھ تک نہیں
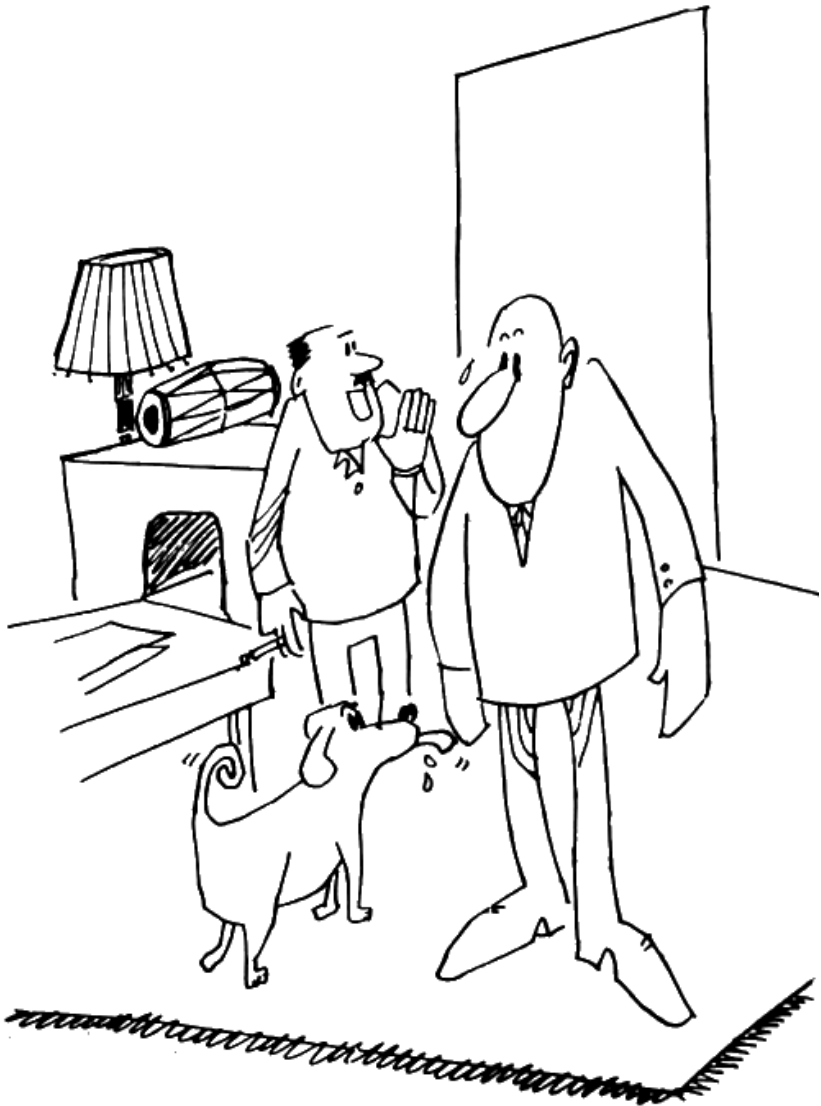
لگاتے لیکن اس وقت جی کڑا کر کے نہایت خندہ پیشانی سے خواجہ سگ پرست بنے رہے کہ اگر بیزاری دکھائی، تو یہ شخص کہے گا کہ دیکھو اس شخص کو پاکستان اور پاکستان کی چیزوں سے اتنی بھی محبّت نہیں ہے۔ وہ تو ہم نے باتوں باتوں میں جتا دیا کہ ہم محبّت کی ظاہری نمائش پسند نہیں کرتے ورنہ کیا عجب وہ ہمیں اور اس کُتّے کو کھانا بھی ایک ہی پلیٹ میں ڈال دیتے کیونکہ وہ پاکستان میں کئی کئی آدمیوں کو ایک ہی پلیٹ میں کھاتے اور ایک ہی ڈونگے سے، ایک ہی مٹکے میں سے نکال نکال کر پانی پیتے دیکھ چکے تھے اور اسے مستحسن بتاتے تھے کہ آپس میں محبّت اور اخوّت بڑھانے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

ورسائی کے رستے میں ہم نے یونہی پوچھ لیا کہ یہ ہوٹل جو آپ نے ہمارے لیے پسند کیا ہے کیا نام ہے اس کا کیا دام ہیں اس کے؟

بولے: ”ڈربی ہوٹل نام ہے۔ ۴۵ فرانک کا ہو گا۔ اس سے زیادہ کا کیا ہو گا۔“ ہم نے کہا۔ ”مذاق کو چھوڑیئے، سچ مچ بتایئے؟“

فرمایا۔ ”مذاق کی کیا بات ہے۔ ۴۵ فرانک کچھ زیادہ تو نہیں۔“

ہم نے کہا ”آپ کو معلوم ہے ہم کوئی رئیسیے تو ہیں نہیں۔ ہمیں کھانے پینے، کپڑے،

دھوبی، نائی، بس گاڑی یہ وہ سارے اخراجات کے لیے کل چالیس فرانک ملتے ہیں اور اب چونکہ ہم فرانس اپنی خوشی سے آئے ہیں۔ یہ بھی نہ ملیں گے۔ ہمارا انتظام تو پندرہ سولہ فرانک والے ہوٹل میں کیا ہوتا بلکہ لیٹن کوارٹرز میں تو سات آٹھ فرانک روز والے ہوٹل بھی ہیں۔"

بولے۔ "اب تو ہو گیا۔"

"۴۵ فرانک۔۔۔ ۴۵ فرانک خداوند ہم یہ کیسے دیں گے؟ کہاں سے دیں گے؟ ہمارا تو سارا اندوختہ پانچ پاؤنڈ ہے۔ یعنی کوئی ساٹھ پینسٹھ فرانک اور ابھی اتنا لمبا سفر ہے۔" ہم اس ادھیڑ بن میں لگ گئے۔ فرمایا۔ یہ سامنے ورسائی کا محل ہے۔ اس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ معاہدہ ہوا تھا جسے معاہدہ ورسائی کہتے ہیں۔

ہم نے کہا۔ "اچھا ہے۔" (لیکن یہ ۴۵ فرانک کا کیا ہو گا)

بولے۔ "خوبصورت ہے نا؟"

ہم نے کہا۔ بہت خوبصورت ہے (۴۵ فرانک) کیا کہنے (۴۵ فرانک)

اب انہوں نے محل کے احاطے کے باہر اپنی گاڑی ایک جگہ کھڑی کر دی اور کہا آؤ

تمہیں پارک دکھاؤں۔

ہماری آتشِ شوق اس دوران سرد ہو چکی تھی۔ ہم نے کہا۔ ”نہیں اب شہر چلیں گے۔“(۴۵ فرانک)

بولے، واہ پارک دیکھے بغیر چلے جاؤ گے۔ یہ دیکھو یہاں سے آکر ذرا منظر دیکھو کتنی دور تک روشوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور وہ دور نہر کا پانی دیکھ رہے ہو۔

ہم نے کہا۔ ”نہر کا پانی؟ ہاں ہاں دیکھ رہے ہیں۔“(۴۵ فرانک)

اب وہ بولے۔ ”اب تمہیں دوسری طرف کا پارک دِکھاؤں۔ ذرا دیکھنا کہ پھولوں اور پودوں کا تناسب کتنا آرٹسٹک ہے اور یہ بُت اور یہ مجسّمے!“

ہم نے کہا۔ ”ہاں یہ بُت، یہ مجسّمے۔ بڑی عالی شان چیزیں ہیں۔ اب چلیں شہر۔“

بولے۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی تو بائیں ہاتھ کا پارک دیکھنا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”نہ بس ہم تو اتنا ہی دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ واللہ بہت ہی طبیعت خوش ہوئی“ (اے شخص! تجھے تو تنخواہ پیرس میں فرانکوں میں ملتی ہے ہمارا تو بیڑہ ڈبو دیا تو نے) واپسی میں ٹریفک کے رش میں خاصا وقت لگا۔ خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔ جب ہم ہوٹل پہنچے ہیں۔ جرمن دوست نے باہر ہی سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گئے۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ہوٹل میں قدم رکھا۔ کاؤنٹر پر ایک ترش رو صاحبہ بیٹھی تھیں۔ ہماری زبان سے پورا فقرہ بھی نہ نکلا۔ سب صرف و نحو بھول گئے تھے۔

ہم نے کہا۔ ”کمرہ۔۔۔ ہمارا نام ابن انشاء۔“

”بولیں۔ ہاں ہاں سُن لیا۔ کمرہ ۸ تیّار ہے“

”کتنے کا ہے؟“

فرمایا۔ ’’چھیاسٹھ فرانک کا!‘‘

ہمیں یقین نہ آیا۔ دوبارہ پوچھا۔

بولیں: ’’ساٹھ جمع چھ۔ چھیاسٹھ۔ کمرے کے ساتھ باتھ روم بھی تو ہے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’باتھ روم کیوں ہے۔ ہمیں تو بس چھوٹا سا سنگل کمرہ چاہیے تھا۔ نہانے کا ہمارے سامنے نام مت لو۔ ہم افیم کھاتے ہیں۔ یوں بھی سردی کا موسم ہے۔ پانی گیلا ہوتا ہے نا۔‘‘

بولیں۔ ’’یہی کمرہ ہے اور کوئی نہیں۔‘‘

’’۴۵ فرانک کا بھی نہیں؟‘‘

’’نہیں‘‘

ہم نے کہا۔ ’’اگر ہم کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں تو؟‘‘

فرمایا۔ ’’شوق سے چلے جایئے لیکن کل۔۔۔ یہ ایک دِن کے تو چھیاسٹھ فرانک ہم وصول کریں گے ہی۔‘‘

ہم نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں گھنی مونچھوں والا ایک ہٹّا کٹّا دربان کھڑا خشونت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم نے کہا۔ ”ہم تو یونہی کہہ رہے تھے۔ مذاق کر رہے تھے بھلا اور کہیں جانے کا کیا سوال ہے۔ ہمیں تو کوئی کہے بھی تو نہ جائیں۔“

ڈربی (ہوٹل) کی ریس کون جیتا؟

کمرہ نمبر ۸ ڈربی ہوٹل۔۔۔ڈربی کے نام پر ہم گھوڑے کی طرح ہنہنائے اپنے سوٹ کیس پر دولتی جھاڑی۔ گھِسی ہوئی دری، ٹیڑھی دیواریں۔ کمرے کے دو حصّے تھے۔ دونوں میں ایک ایک پلنگ۔ ہم نے بجلی کا بٹن دبایا تو کمرے کے دوسرے حصّے میں روشنی ہوئی۔ وہاں بھی ایک بٹن تھا۔ اس سے اِدھر کا کمرہ روشن ہوا۔ غسل خانہ بھی تھا اور دروازے کے اندر ایک نوٹس بھی لٹکا تھا کہ اس کمرے میں تین آدمی رہیں تو ۸۷ فرانک دیں۔ دو رہیں تو ۷۰ فرانک اور ایک آدمی ہو تو فقط ۶۶ فرانک۔ ہم نے غنیمت جانا کہ ہم ایک ہی آدمی ہیں۔ ورنہ ۸۷ فرانک دینے پڑتے۔ ۱۸ فرانک کی تو سیدھی سیدھی یہ بچت ہو گئی۔

ہم نے ٹیلی فون اٹھایا۔ پاکستان سفارت خانہ "ہاشم۔"

بولے۔ "ہاں آ گئے۔ آ جاؤ۔"

"کیسے آئیں؟"

بولے۔ "پیرس میں ٹیکسیوں کی کمی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا۔ ہم سے ٹیکسی ویکسی کی بات مت کرو۔ ہم تو شہر کو پیدل چل کر دیکھنے کے عادی ہیں اور پھر پیرس جیسا شہر تمہارا گھر دور تو ہے لیکن پہنچ جائیں گے۔ کوئی پَون گھنٹے میں اور ہاں کھانا ملنا چاہیے کہیں کافی وغیرہ پر ٹالنے کی کوشش کرو۔۔۔!

بھٹکتے، نقشہ دیکھتے، سڑکوں کے نام پڑھتے۔ پانچ پاؤنڈ کو تیرہ سے ضرب دے کر ان کے فرانک بناتے جیبوں میں مختلف ملکوں کی نجی ریزگاری گنتے۔ ہاشم کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے جاتے ہی کہا۔

"آدم بو۔ آدم بو کھانا کہاں ہے۔"

بولے۔ "یہاں نہیں ہے ایک ویت نامی ریستوران میں کھلائیں گے تمہیں ایک دو دوست اور بھی ساتھ ہوں گے۔ کہو، سفر تو اچھا گزرا؟"

ہم نے کہا۔ "فضول باتیں ہم سے مت کرو۔"

یہ ویت نامی ریستوران بہت پُر اسرار سا تھا۔ نیم تاریک کمروں میں جالے لگے ہوئے فرش پر پھٹے کاغذوں اور کوڑے کے انبار لکڑی اور ٹین کی جھولتی ہوئی کرسیاں، ایک پھوسڑے نکلا ہوا صوفہ، دیواروں پر کچھ پوسٹر، کُچھ پتہ نہ چلا کہ ہنوئی والے ویت نامی ہیں یا سائیگاؤں والے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب فرنچ داں تھے۔ انہوں نے کاؤنٹر پر جاکر طویل مذاکرات کیے اور اس کے بعد پیسے ادا کیے۔ ہم نے کہا۔ "یہ کیا؟"

بولے۔ "اس ریستوران کا دستور ہے پیسے پہلے لیتے ہیں۔ کھانا بعد میں دیتے ہیں۔"

لاتے ہیں سرورِ اوّل۔۔۔ دیتے ہیں شراب آخر۔

یہ ریستوران بس اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل تھا۔ مٹلو عورتیں پتھّر کی میزوں پر

پوچی پھیرتی اور کھانا پروستی ہوئی۔ ہم چھ ساڑھے چھ آدمی (ہاشم کی بیگم اور ان کا بچّہ تن موئے بھی ساتھ تھا) ایک چھوٹی سی میز پر آپس میں گھٹنے بھڑاتے ہوئے بیٹھے۔ چاول آئے، پیالوں میں کچھ دھوون سا آیا۔ پھر چینی ریستوران کا سا کھانا لال مرچوں کی چٹنی بھی۔

دھوون تو ہم پی نہ سکے چاولوں پر تھوڑا سا چکن کا ٹکڑا رکھا مرچیں ڈالیں، اور چمچے سے نوش کر گئے۔ ہاشم نے مہذّب بننے کی کوشش میں پہلے اپنا کانٹا زمین پر گرایا پھر بیگم کا کانٹا مانگا اور ِگرایا۔ ہاں کچھ چاول ہم نے بھی گرائے۔

"اتنے میں گیارہ بجے کا عمل ہو گیا۔ ہوٹل ڈربی کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی لہٰذا ہاشم سے ہم نے کہا آج ہمیں پیرس کی گلیوں میں گھماؤ۔"

جانے یہ ریستوران کہاں واقع تھا اور ہم ِکن ِکن کوچوں سے ہو کر نکلے۔ بعض سڑکوں پر تو اس طرح چراغاں ہو رہا تھا جیسے ہمارے ہاں نو دولتوں کی بیاہ شادیوں میں ہوتا ہے۔ شاید کرسمس کی ریہرسل تھی۔ یہ پرانی سبزی منڈی ہے جسے اب ڈھایا جارہا ہے یہ پگال ہے۔ عریاں کلبوں کی قطار در قطار۔ یہ شاتلے تیز روشنیوں تلے دعوتِ نظارہ اور دعوت نہ جانے کیا کیا! گاہک منڈلاتے ہوئے۔ ہم نے ہاشم

سے کہا۔۔۔ خیر ہو چکی سیر۔۔۔ اب واپس!

"چھیاسٹھ فرانک"

ہم نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی چیز ڈھنگ کی ہو تو بطور فرانس کی یاد گار کے اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لیتے چلیں۔ سوائے کپڑے ٹانگنے کے معمولی ہینگروں کے کچھ بھی نہ تھا۔ نیند ہماری غائب ہو چکی تھی۔ ہم کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گئے اور حساب جوڑنے لگے۔

ہمارا ارادہ تو پندرہ فرانک والے ہوٹل میں ٹھہرنے کا تھا لیکن ممکن ہے، اس میں کمرہ نہ ملتا لہٰذا پچیس فرانک دیتے۔ گویا یہاں فقط ۴۱ فرانک زائد دے رہے ہیں۔ ہاشم کے گھر پیدل جا کر بچائے کم از کم پانچ فرانک۔ کل ائیر پورٹ پر قلی نہ لیں گے سامان خود اٹھائیں گے۔ مزید بچت تین فرانک۔ کل دوپہر فاقہ کریں گے کہ معدے کے فعل کو درست رکھتا ہے ہاں چائے پی لیں گے بچت چھ فرانک۔

بقیہ سفر میں اخبار نہیں خریدیں گے۔۔۔ پانچ فرانک۔

بال نہیں کٹوائیں گے۔۔۔ پانچ فرانک۔

گھر خط نہیں لکھیں گے۔۔۔دو فرانک

یہ ہو گئے چھبیس فرانک ابھی ہمیں پندرہ فرانک اور بچانے تھے۔

اچھا تو بیروں کو ٹپ بھی نہیں دیں گے۔ یہ مونچھوں والا دربان ہمیں یوں بھی پسند نہیں اور سوٹ کیس ہم خود اُٹھا کر لائے تھے۔ مزید بچت تین فرانک۔ اِن کا ایک تولیہ اُٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیا۔ چار فرانک کا تو ہو گا ہی لیکن اس پر تو ہوٹل ڈربی لکھا تھا اور پھر ہمارے سوٹ کیس میں جگہ بھی نہ تھی۔ لہٰذا اس خیال کو رد کر دیا۔ بلب اتارنے کا خیال بھی نہ جچا کیونکہ ان لوگوں نے پیش بندی کر رکھی تھی۔ بہت اونچا لگا رکھا تھا اور ابھی ہمیں بارہ فرانک بچانے تھے۔

ہم نے سوچا اتنا اونچا ہوٹل ہے۔ ناشتے میں انڈا ضرور دیں گے جو پندرہ بیس فرانک والے ہوٹل نہیں دیتے۔ آدھے فرانک کا انڈا ہوا باقی ساڑھے گیارہ فرانک یاد آیا کہ لوور ہم نہیں جا پائے۔ جاتے تو ٹکٹ لینا پڑتا ورنہ گائیڈ بُک یا کارڈ خریدتے تین ساڑھے تین فرانک اس میں لگانے چاہئیں۔

اب بس آٹھ فرانک کا حساب ہمیں اور جوڑنا تھا۔

کیوں نہ ان کا لفٹ بار بار استعمال کر کے ان کی بجلی خرچ کریں۔ سیڑھیوں پر سے اُترنے میں جوتے کی جو گھِسائی ہوتی ہے وہ بھی بچے گی۔ دو فرانک اس مد میں بھی بچائیں۔

باقی رہے چھ۔

ایش ٹرے اٹھا کر تھیلے میں ڈال لی۔ ایک فرانک اس کے دام لگائے باقی پانچ فرانک۔

غسل خانے میں سے صابن بھی اٹھا کر تھیلے میں رکھا۔ باقی چار۔

اتنے میں یاد آیا کہ ایمسٹرڈم اور بون وغیرہ میں ڈھائی ڈھائی فرانک نہانے کے دیے تھے یہاں غسل خانہ موجود ہے۔ ایک اب نہائیں۔ ایک کل صُبح اُٹھ کر نہائیں یعنی پانچ فرانک وصول کریں۔ گویا ایک فرانک کا فائدہ ہمیں رہا۔ ہمارا چہرہ خوشی سے کھِل گیا اور ہم کپڑوں سے باہر ہو کر ٹب میں بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا توازن ادائیگی موافق ہونے کے باوجود ہمارے دِل کا غبار ابھی تک پورا نہ دُھلا تھا۔ لہٰذا ہم نے ٹب میں بیٹھ کر غزل گاتے ہوئے (ہم ہی میں

تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے) خوب چھینٹے اڑائے کہ خود ہی فرش صاف کرتے پھیریں گے۔ گویا ایک آدھ فرانک کے تلے اور ان لوگوں کو دبایا۔ ہم عموماً کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے لیکن جو لوگ دوسروں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔

پراگ (۱۳ نومبر تا ۱۷ نومبر) اور وارسا کا ۱۸ نومبر تا ۲۰ نومبر کا احول لکھا نہیں جا سکا۔

ویانا

۲۰،۲۱ نومبر ۱۹۶۷ء

ہم ویانا پہنچتے ہی ڈی ویلیو ہو گئے۔

مولوی محبوب عالم ویانا گئے تھے تو ہم کیوں نہ جاتے۔ یہ سچ ہے کہ آنکھوں والوں کے لیے ویانا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً آنکھوں کی پیچیدہ بیماریوں کے اسپتال ہمارے بہت سے آئی اسپیشلسٹ یہیں سے بصیرت حاصل کر کے گئے ہیں۔ لیکن ہم جو اپنی سیدھی راہ چھوڑ کر ویانا گئے تو اس میں مولوی محبوب عالم سے ہمارے جذبۂ مسابقت کو بہت دخل تھا۔ ویانا کسی طرح ہمارے پروگرام میں نہ آتا تھا اور سبھی ملکوں میں تو ہمارا کُچھ نہ کُچھ جھوٹا سچّا منصبی کام تھا۔ یہاں ہمیں از خود رہنا اور اپنی گرہ سے خرچ کرنا تھا۔ ہم نے ہوائی اڈّے پر آکر فرمائش کی کہ کوئی سستا سا بغیر غسل خانے کا ہوٹل بتا دو۔ ہم نے تو سرائے کہا تھا لیکن یہ لفظ وہاں کوئی نہ سمجھا۔ انہوں نے کہا: اچھا کانگریس ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ایک سو بیس شلنگ روزانہ دے دینا۔ ہم نے کہا۔۔۔ ہم پرانے مسلم لیگی ہیں۔ آج تک کانگریس سے کوئی تعلّق نہ رکھا۔ اب اس
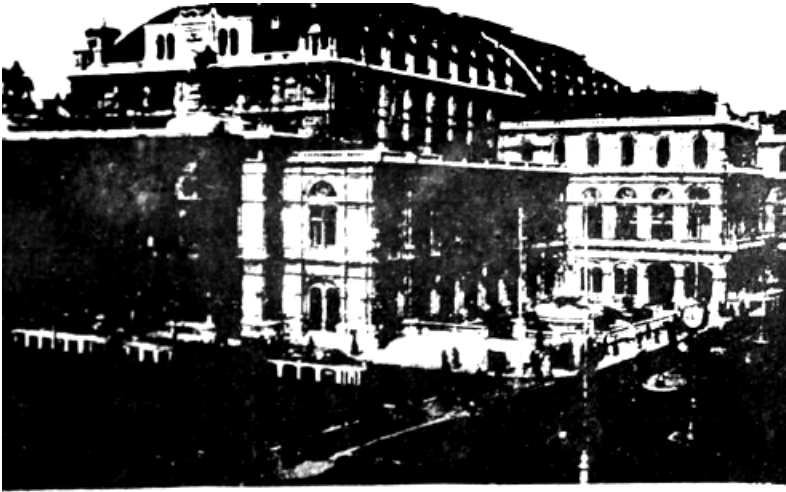
ویانا— (اُوپر) رنگ اسٹراس میں آپرا (نیچے) مشہور بازار گربین

میں کیوں داخل ہوں۔ اس پر اور غیر کانگریسی ہوٹل انہوں نے بتائے لیکن وہ زیادہ مہنگے تھے۔ آخر ہم نے کہا: میاں آزاد چلو وہیں چلو۔۔۔ شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں۔ ایک سو بیس شلنگ کچھ کم نہیں۔ ہم نے حساب لگایا تو بلبلا اُٹھے لیکن یہ جان کر قدرے سکون ہوا کہ یہ برطانوی شلنگ نہیں ہیں بلکہ ایک ڈالر میں پچیس والے ہیں۔ ایک روپے میں پانچ جانیے۔ ڈالر والر کی کیا حقیقت ہے ہم پیسے والے آدمی ہیں۔ ہماری جیب میں پانچ پانچ پاؤنڈ کے نوٹ تھے ایک نہیں دو تین۔۔۔ ہم نے ایک پھینکا کہ لاؤ شلنگ دے دو۔ ایکسچینج والے نے اسی طرح اٹھا کر ہمیں دے دیا اور کہا یہ نہیں چلے گا۔ کوئی اور سِکّہ ہے تو لاؤ۔

ہم نے کہا: ”کیوں کھوٹا ہے کیا؟“

بولے: کھوٹے کھرے کا میں نہیں جانتا لیکن فی الحال اس کا بھاؤ نہیں نکلا۔۔۔

ہم نے کہا۔ ”بھاؤ ہم بتاتے ہیں ایک پاؤنڈ میں ۲ء۸۰ ڈالر ہوتے ہیں۔ احتیاطاً لکھ لو۔“

بولا۔ ”جی نہیں۔ اب نہیں ہوتے۔ آپ نے اخبار نہیں پڑھا۔ آج سے پاؤنڈ ڈی ویلیو ہو گیا۔“

ہماری آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے۔ ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ حکومتِ برطانیہ ہماری پشت میں یوں چھُرا گھونپے گی۔ ہم سے صلاح کیے بغیر اسٹرلنگ کی قیمت گھٹا دے گی۔ یہ جو عرب ملک کے اتنے سارے اسٹرلنگ برطانوی بینکوں میں ہیں اُن کا کیا ہو گا۔ امیر کویت کو، شاہ سعودی عرب کو، سلطان ابو ظبی کو اور خود ہمیں برطانیہ کے اس عمل سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی ذمّہ داری کس پر ہے۔ ہم نے پورٹر سے پوچھا: ”میاں یہ سامان کہاں لیے جا رہے ہو ہمارا۔ ہماری اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے کوئی جہاز قاہرہ جانے والا ہو تو اس میں لے چلو، کراچی جانے والا ہو تو اور اچھا ہے۔“

بولا ”جی کراچی تو پتہ نہیں۔ قاہرہ اب پرسوں جائے گا جہاز۔ جلدی کیجیے شہر کی بس چھوٹنے والی ہے۔ دس شلنگ عنایت فرمایئے۔ ڈانکے شرن شکریہ!“

اس قسم کی ہم پر چوٹ پڑے تو ہماری نیند تو بے شک حرام ہو جاتی ہے اور کوئی خاص پروا ہم نہیں کرتے۔ چنانچہ ہوٹل میں فروکش ہوتے ہی ہم نے مولوی محبوب عالم کا سفر نامہ نکال لیا۔ اتنے میں منیجر صاحب نے فون کیا کہ آپ ویانا کا شبینہ ٹور لیں گے؟ آٹھ بجے شروع ہو گا مزے کا ہے بس جگہ جگہ گھمائے گی۔ ریستورانوں میں باغوں میں رقص گاہوں میں اور آخر میں ایک عُریاں کلب میں بھی لے جائے گی۔

وائن یعنی شراب کا بھی انتظام ہے۔

”پورک یعنی سؤر کے گوشت کا بھی؟“ ہم نے پوچھا۔

بولے: ”جی ہاں۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ انتظام ہوٹل کی طرف سے ہے؟ یعنی ہمارے کرائے میں شامل ہے۔“

منیجر صاحب نے کہا: ”جی ٹکٹ آپ کو یہیں سے مل جائے گا۔ آپ کے بل میں ہم لگا دیں گے۔ دو سو شلنگ کا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمیں پریشان مت کرو۔ ہمیں نیند آ رہی ہے اور پورک ہم نہیں کھاتے۔“

یہ کہہ کر ہم پھر سفر نامے میں جٹ گئے۔ معلوم ہوا کہ اے اللہ کے بندے اگر تجھے ویانا دیکھنا ہے تو مہینہ بھر ورنہ ہفتے دو ہفتے کو یہاں ٹھہر۔۔۔ میوزیم، لائبریریاں، محل اوپرا، تھیٹر، باغ، کوچے بازار۔۔۔ آج بے شک آسٹریا کو لوگ سیاسی طور پر شمار میں نہ لائیں لیکن ایک زمانے میں تو یہ غالباً یورپ کی سب سے بڑی سلطنت

تھی۔ یہ چیکوسلوواکیہ، ہنگری، جرمنی وغیرہ سب زیر نگین تھے۔ ویانا یورپ کا قلب تھا۔ آج سے تین چار صدی پہلے تو جب تُرکوں کا اقبال آسمان پر چشمک زنی کرتا تھا۔ انہوں نے ویانا کو بھی اپنی جاگیر میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلی دفعہ سلطان سلیمان ثانی نے ۲۲ ستمبر تا ۱۵ اکتوبر ۱۵۲۵ء اور دوسری بار قار مصطفٰے صدر اعظم ترکی نے ۱۴ جولائی تا ۱۲ ستمبر ۱۶۸۳ء ویانا کا محاصرہ رکھا۔ لیکن آسٹریا کی مدد پر اہلِ پولینڈ آ گئے۔ اہلِ سیکسنی آ گئے۔ اہلِ بویریا آ گئے اور اہلِ فرانس آ گئے۔ ان کی متّحدہ قوّت کے سامنے تُرکوں کی ترکتاز کامیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ؟ ورنہ کا مولوی محبوب عالم نے بھی سوچا۔ ہم نے بھی سوچا۔ یہ جو سامنے جابجا گرجوں کے نکیلے مینار نظر آتے ہیں، کیا عجب یہاں سلیمانیہ اور ینی جامع کی سی مسجدوں کے گُنبد ہوتے۔

آج سے ستّر سال پہلے کا ہندوستان دیکھیے جہاں سے مولوی محبوب عالم آئے تھے اور ستّر سال پہلے کا ویانا۔۔۔ بیان کرتے ہیں کہ "ہوٹلوں میں لفٹ تھے۔ ٹرامیں کچھ دُخانی تھیں۔ کچھ بجلی سے چلنے والی بھی جیسی آج کل ہیں۔ اخبار لاکھوں کی تعداد میں چھپتے تھے۔ مولوی صاحب نے اخبار 'ویز تاک بلاٹ' کا کارخانہ دیکھا۔ معلوم ہوا کہ ایک لاکھ پرچہ ہر روز چھپتا ہے اور صُبح و شام دو مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ اس کارخانہ میں ایک ہزار آدمی ملازم ہیں۔ تمام کام کلوں سے ہوتا ہے، سِکّہ کے حروف بھی لینو

ٹائپ کلوں کے ذریعے جوڑے جاتے ہیں۔ کئی مشینیں چھاپنے کی موجود ہیں لیکن سب سے بڑی مشین ایک گھنٹے میں ۳۲ صفحے کے ۳۲ ہزار اخبار چھاپ کر، کاٹ کر، اور موڑ کر رکھ دیتی ہے بلکہ شمار کرنے والی مشین بھی ساتھ لگی ہے، جو خود بخود بتلاتی جاتی ہے کہ کتنا اخبار چھپ چکا۔۔۔ یہ کارخانہ برقی طاقت سے چلتا ہے۔ مولوی صاحب نے ویانا کے عجائب گھر دیکھے۔ تھیٹر دیکھے پارلیمنٹ ہاؤس دیکھا۔ پراتر کے عجائبات دیکھے کہ ایک وسیع پارک ہے جس میں تفریح کی بے شمار چیزیں ہیں اور جس میں ہمیشہ میلہ لگا رہتا ہے۔ ویانا کی خوش دِل عورتوں نے اُن سے چہلیں بھی کیں۔ مولوی صاحب نے چونکہ صرف گفتنی درجِ گزٹ کیا ہے۔ لہٰذا اُن کے ردِّ عمل کا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لکھتے ہیں "پارک میں سڑک ہے، دونوں طرف درخت ہیں۔ درختوں کی تمام شاخوں پر سُرخ سبز اور سفید روشنی کے برقی لیمپ لگے ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے سب لیمپ روشن ہو جاتے ہیں اور بالکل طلِسمات کا باغ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مختلف رنگوں کے باریک کاغذوں کے گول گول ٹکڑوں کی لوگ مٹھیاں بھر بھر کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں۔ عموماً مرد خوب صورت عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر۔ پہلے واقفیت اور آشنائی کی کوئی شرط نہیں۔ جس پر تمہارا جی چاہے پھینکو۔ کوئی داد فریاد نہیں بلکہ سب لوگ خوش ہوتے ہیں۔ زمین

پر دو انگل موٹا فرش اِن کاغذی پھولوں کا ہو جاتا ہے۔ ایک دو عورتوں نے مُجھ پر بھی پھینکے۔ جب میں نے جواب نہ دیا تو ایک کم بخت نے پشت کی طرف سے میرے کالر کو اُٹھا کر ایک مٹھی اس میں پھینک دی جو میں نے مکان پر جا کر نکالی۔۔۔ معلوم ہوا۔۔۔ اس ذریعہ سے بعض عورتیں مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک پرستان کا نظارہ تھا سچ یہ ہے کہ انسان ان کے آسیب سے مشکل سے بچ سکتا ہے ہاروت و ماروت کی آزمائش کا قصّہ اگر صحیح ہے تو وہ معذور تھے۔"

لیکن میاں انشا کو تو بس دو روز یہاں ٹھہرنا تھا اور ان کے پاؤنڈ ڈی ویلیو ہو گئے تھے اور یہ موسم سردیوں کا تھا، اور یہ حسینائیں مہ جبینائیں جانے کہاں تھیں۔ اچھا تو کل پراتر کی سیر بھی کریں گے۔

آج ہم نے جی لڑا کر کے شہر کا ٹور لے ہی لیا۔ سترّ شلنگ۔ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے۔ ہم نے تو آج تک اس کی کبھی پروانہ کی۔

بس اوپرا ہاؤس سے چلی۔ گائیڈ نے کتھا باچنی شروع کی۔ "یہ رِنگ ہے یعنی یہاں کی سرکلر روڈ۔ اُدھر باغ عامہ ہے۔ یہ اِدھر آرٹ کا عجائب گھر ہے جو آج پیر ہونے کے باعث بند ہے اور یہ سامنے تاریخ کا عجائب گھر ہے (اس میں بھی نہیں لے کر گیا)

اور یہ بیچوں بیچ ملکہ ماریا تھریسا کا مجسّمہ ہے اور اب صاحبو! وہ دیکھو پارلیمنٹ کا ایوان۔ اچھا تو اب ہم قصرِ حکومت کے سامنے آ گئے۔ اس میں پریذیڈنٹ رہتا ہے، صدر ڈولفس بھی۔ ۱۹۳۶ء میں اس عمارت میں قتل ہوا تھا۔ یہ قیصرِ گرفت Kaisergruft ہے۔ اس کے اندر چلتے ہیں کیونکہ اس میں بادشاہوں کے تابوت رکھے ہیں۔ یہ فرنز جوزف کا تابوت ہے۔ یہ ملکہ ماریا تھریسا کا۔ یہ فلاں بادشاہ کا یہ فلاں ولی عہد کا۔ اور اب چلو باہر۔ یہ پرانا گرجا بھی دیکھو۔ یہ مشہور سڑک ہے میریا ہلفر سٹر اس۔ شاپنگ کے لیے بہترین جگہ (ہم نے فوراً نام نوٹ کر لیا کہ کوئی یہاں آئے گا تو اسے لکھوا دیں گے یہاں خریداری کرے) اور اب صاحبو یہ سامنے مشہور برن پیلس ہے۔ شاہانِ آسٹریا کا محل جس کی تعمیر میں ۵۵ برس لگے۔ اس میں چودہ سو کمرے ہیں اور ایک سو چالیس باورچی خانے ہیں۔"

ہمیں اُس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا۔ اتنے سارے باورچی خانوں میں کیا کیا پکتا تھا لیکن وہ گائیڈ ہمیں تفصیلات نہ بتا سکا۔ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا۔ یہ محل ورسائی کی نقل تھا۔ گائیڈ نے جو یہ حوالہ دیا تو اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ ہمیں فوراً اپنے چھیاسٹھ فرانک پیرس والے یاد آ گئے۔ اب اس کے کمروں کی سیر شروع ہوئی۔ یہ خواب گاہ، یہ بیٹھک، یہ دربار گاہ، یہ رقص کا ہال

سب ایک سے ایک بڑھ کر۔ سب میں تصویریں۔ یہ ملکہ تھریسا ہیں۔ یہ اُن کے باپ کی تصویر ہے۔ یہ اُن کا بیٹا ہے۔ یہ اُن کی بیٹیوں کی تصویریں ہیں۔ ہم نے کہا۔ ''ماشاء اللہ کتنی اولاد تھی ملکہ عالیہ کی۔ ''معلوم ہوا سولہ۔ گیارہ اُن میں لڑکیاں تھیں اور پانچ لڑکے۔ ایک اور عورت کی تصویر لگی تھی۔ ہم نے کہا یہ کون ہے بولیں یہ ان کی بیٹی ہے۔ اس کی اٹھارہ اولادیں تھیں۔ ہم نے کہا ماشاء اللہ۔۔۔ فیملی پلاننگ کا محکمہ نہیں تھا ان دِنوں کیا؟

ملکہ عالیہ میریا تھِریسا

یہاں شاید ابھی تک اس کا رواج نہیں کیونکہ گائیڈ نے پوچھا فیملی پلاننگ کیا ہوتی ہے؟ ویسے ملکۂ عالیہ کے یہ اولاد خوب کام آئی۔ سب کی شادیاں زبردستی کر کے یورپ کے تاجداروں سے کیں۔ فرانس کا بادشاہ، اسپین کا بادشاہ، اٹلی کا بادشاہ، یہاں کا بادشاہ، وہاں کا بادشاہ۔ سب کو فرزندی میں لے کر بغیر تلوار چلائے اور خون بہائے سارے یورپ کی ملکہ بن گئیں۔ گویا ہمارے کروڑپتی کارخانہ دار جو دوسرے کارخانہ داروں کو اپنی بیٹیاں بیاہتے ہیں۔ یہ نسخہ کوئی نیا نہیں۔ انہوں نے ملکہ ماریاتھریسا سے لیا ہے۔

ایک سڑک پر سے گزرتے ہوئے گائیڈ نے کہا تھا۔ یہ موتسارٹ Mozart کا مجسّمہ ہے اور اب شون برس پیلس میں بھی کئی تصویریں انہوں نے بتائیں کہ یہ موتسارٹ ہے پانچ برس کی عمر میں۔ یہ پندرہ برس کی عمر میں۔ آخر ہم نے کہا کون تھا موتسارٹ یہ بھی تو بتاؤ۔

تب پتہ چلا کہ بیتھوون کی طرح کا کوئی گوّیا تھا۔ یورپ میں ہم جا بجا موتسارٹ، بیتھوون، باخ شوبرٹ وغیرہ کے مجسّمے اور اُن کے نام کی سڑکیں دیکھیں جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہرچند اس وقت ریڈیو پاکستان کی شاخیں یورپ میں نہ تھیں۔ نہ فلم کمپنیاں تھیں لیکن گانے بجانے والے بھوکے نہیں مرتے تھے۔ کلاونتوں کی

خاصی قدر تھی۔

اور پھر اس گائیڈ کے بچّے نے شون برن پلیس سے لوٹا کر گاڑی پھر اوپرا کے سامنے لا کھڑی کی اور کہا صاحبان یہ ٹور ختم۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اُمّید ہے کہ ویانا میں آپ کا قیام خوشگوار گزرے گا۔

یہ کہہ کر وہ ٹِپ لینے کے لیے بس کا دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

ہم نے کہا۔ ”میاں پراتر تو تم نے دِکھایا ہی نہیں۔ وہ کاغذی پھولوں کی مٹھیاں پھینکنے والی پری جمال عورتیں کہاں ہیں۔ تمہارے خیال میں ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں؟“ بولا۔ ”پراتر کا ٹور ڈھائی بجے شروع ہو گا۔ اس میں دریائے ڈینیوب بھی دکھائیں گے۔ اس کا ٹکٹ بھی ستّر شلنگ ہے دوں آپ کو؟“

پردیس کا معاملہ تھا اور کوئی تھانیدار یہاں ہمارا جاننے والا نہیں تھا۔۔۔ نہ ہوا کراچی۔

قاہرہ

۲۲ نومبر تا ۲۸ نومبر ۱۹۶۷ء

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

"مطعم مستنصر۔ فندق ابو صفین، شارع سلامہ، صالون عفیفی، حلوانی الاخلاص میدان التحریر۔"

ہم نے ٹھٹک کر اپنے کو غور سے دیکھا اور پوچھا، "یا شیخ تیرا نام عبد العزیز خالد تو نہیں ہے۔"

جواب ملا۔ "نہیں"

"ضیاء الحسن موسوی"

اس کا جواب بھی نفی میں ملا تو ہم نے نہایت تاسف سے کہا۔ لو بھئی۔ بھیجنے والوں نے غَلَط آدمی بھیج دیا یہاں۔ اے شخص تو کیا لینے آیا ہے قاہرہ؟

قصّہ غلط آدمی کا راویانِ رطب اللّسان یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک میاں دہقانی کو

قریب شام ایک اجنبی مسافر رستے میں مل گیا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے آئے۔ کھلا پلا کر اپنے ہی کمرے میں (اگر دہقانی کے مکان میں ایک سے زیادہ کمرے ہوتے ہیں تو) سلایا۔ دہقانی میاں کو اگلی صُبح تڑکے ہی ایک کام سے دوسرے گاؤں میں جانا تھا لہٰذا انہوں نے اپنی ماں سے کہا: "ماں ماں! کل صُبح مجھے بڑے تڑکے اُٹھا دیجیو اور ہاں مہمان کو صُبح اچھا ناشتہ دینے کے بعد رُخصت کیجیو"۔

ماں نے کہا۔ "اچھا بیٹا"

ماں نے تڑکے ہی ہانک لگا دی۔ دہقانی میاں نے جانے کی وحشت میں اپنی بجائے مسافر کا پاجامہ پہن لیا۔ (اگر دہقانی پاجامے پہنا کرتے ہیں تو) گھر سے دو کوس دور گئے ہوں گے کہ اجالا ہوا اور ان کی نظر یک لخت اپنی ٹانگوں پر پڑی وہاں اجنبی کا دھاری دار پاجامہ نظر آیا تو بول اٹھے۔

"میری ماں بھی کتنی بے وقوف ہے۔ اُٹھانا تھا مجھے۔ اُٹھا کے بھیج دیا مسافر کو"

اس روز صُبح ہم ڈینیوب کے ساحل پر گھومتے پائے گئے اور شام ہمیں نیل کے کنارے ہوئی۔

ویانا میں آخری دِن یورپ میں ہمارا آخری دِن تھا اور کڑاکے کی سردی کا بھی۔ صُبح اُٹھے تو باوجود اپنے اوور کوٹ کے کہ دمِ تحریر ناحق کا جھول معلوم ہوتا ہے، ٹھٹھر کر رہ گئے اور دستانے لینے بھاگے۔ کنٹوپ کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ سڑک اور گھاس سب سفید ہورہی تھی، برف تھی یا پالا، کہہ نہیں سکتے ہمارے پاس اب صرف آدھا دِن تھا۔ اس میں فوکر کنڈے میوزیم بھی دیکھنا تھا اور پراتو کی تفریح گاہ بھی۔ پھر نیلے ڈینیوب کی زیارت بھی کرنی تھی۔ میوزیم کوئی دس بجے کھلتا تھا لہٰذا ہم نے اوپرا کے سامنے سے BK ٹرام پکڑی اور پراتر کی طرف سدھارے۔ صُبح اور سردی کی صُبح۔ وہاں اس وقت کیا دھرا تھا۔ پراتر کے سارے مزے تو مولوی محبوب عالم لوٹ کے لے گئے تھے۔ ہاں نیلے ڈینیوب سے ہم نے دُعا سلام کر لی اور چلے سوئے فوکر کنڈے میوزیم۔ دیس دیس کے رہن سہن کے عجائب گھر مولوی محبوب عالم لکھتے ہیں:

"اس میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کا نقشہ چند کاشت کاروں کے بُت بنا کر دِکھایا گیا ہے۔ یہ بنگال کے مزارع تھے۔ سیاہ فام اور بالکل برہنہ تن۔ ان کے پاس چھپر کا ایک جھونپڑا تھا۔ اگر ان کو دیکھ کر یہاں کے لوگ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی سمجھ لیں تو ان کا کچھ قصور نہیں۔ چنانچہ جب میں عجائب گاہ سے نکلا تو دربان نے میرے

گائیڈ سے پوچھا کہ ان کپڑوں کو جو میں اس وقت پہنے ہوئے تھا وطن میں جا کر کیا کروں گا! وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان جا کر میں سب کپڑے اُتار کر پھینک دوں گا اور جب میں نے اپنی نوٹ بُک میں کچھ اندراج کیا تو اسے یہ معلوم کر کے بہت تعجّب ہوا کہ ہندوستانی لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں۔"

لیکن ہم ہمہ تن اشتیاق اس عجائب گھر کے دروازے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج بند رہے گا۔ ہم نے ایک اہلکار سے کہا "اے ظالم۔ ہم تو ویانا آئے ہی اس میوزیم کے لیے ہیں۔ کھول اسے!" لیکن بے کار۔ اس نے کہا یہ تو بند ہے اور یہ سامنے والا ہسٹری میوزیم بھی آج بروز منگل بند رہے گا۔ آپ پکچر گیلری دیکھ لیجیے۔ ہر چند کہ یورپ میں مصوّری کے شاہکار دیکھ دیکھ کر ہمارا سینہ آرٹ کے رموز سے بے طرح مملو ہو چکا تھا تاہم مجبوراً وہاں گئے اور جب گئے تو تصویریں بھی دیکھیں اور کچھ کو پسند بھی کیا۔ خاص طور پر سولھویں صدی کے مشہور مصوّر بروگل کی تصویروں کو۔ جنیوا میں ہمیں ہوڈلر پسند آئے تھے۔ لوسرن میں پنیوراما کا کینوس دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے اور یہاں بروگل نے، کہ جزئیات کا بادشاہ ہے ایک چوک کا نقشہ کھینچ رکھا تھا جس میں ہانک لگا کر مچھلی روٹی بیچنے والے، اپاہج، بھک منگے، بے فکرے سبھی کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ بس۔۔۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لیکن یہ ہم کیا تفصیل لے کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اس سے کیا دلچسپی، یہ موضوع تو ہم ایسے فنونِ لطیفہ کے مبصّروں کا ہے۔

ویانا سے استنبول اور استنبول میں آدھ گھنٹہ ٹھیکی لے کر قاہرہ۔۔۔ ساٹھ پینسٹھ نشستوں کے، کے ایل ایم جہاز میں ہم کل پانچ آدمی تھے۔ قاہرہ کے ہوائی اڈّے پر شام کے پونے نو بجے اترے تو وہاں قُلی تو بے شمار تھے۔ کسی مسافر کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کسٹم والوں نے اور پاسپورٹ والوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پوچھ گچھ کیا معنی، ان کا بس چلتا تو ہمارے گلے میں ہار ڈالتے۔ بنک کے ایکس چینج کاؤنٹر پر ہم نے بے نیازی سے پانچ پاؤنڈ کا نوٹ پھینکا اور کہا فی الحال ایک پاؤنڈ کے مصری سکے دے دو۔ خزانچی بولا۔ جناب میرے پاس واپس کرنے کو چار پاؤنڈ کہاں ہیں؟ آخر ہم نے بٹوے کی تلاشی لے کر دو ڈالر بر آمد کیے۔ ایک اور پاکستانی مسافر سیّد آفتاب احمد کینیڈا سے آتے ہوئے دو دِن کو یہاں اُترے تھے۔ انہوں نے ایک ڈالر بھنایا۔ باقی مسافر شاید مصری تھے۔ یا تو یورپ میں یہ عالم تھا کہ ہم اپنے سامان کے چاروں نگ خود اُٹھا کر بس تک لائے تھے۔ کیونکہ ہوٹل کانگریس میں دس فیصد سروس چارج تو ضرور لیے جاتے تھے لیکن دربان یا حمال قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یا یہاں دیکھا کہ

پانچ آدمی صرف ہمارے سامان کے لیے لپکے۔ ایک سوٹ کیس، ایک نے اٹھایا۔ دوسرا دوسرے نے، تیسرے نے ہمارے شیو کے سامان کا تھیلا تھاما، چوتھے نے ہمارے ہاتھ سے ہمارا بریف کیس چھین لیا۔ اب ہمارے پاس فقط لندن ٹائمز کا اس روز کا پرچہ رہ گیا تھا، سو اسے پانچویں آدمی نے لے لیا اور سلام کیا کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں، اور پھر ان بھلے مانسوں نے آدھے راستے میں یعنی ہماری کار سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ان چیزوں کو رکھ دیا۔ وہاں سے دوسرے آدمیوں کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی تھی، وہاں ہم نے صرف تین آدمیوں کی خدمات حاصل کیں چوتھے کو کوئی سامان نہ ملا۔ تو اس نے دوڑ کر ہماری کار کا دروازہ کھولا اور بتیسی نکال دی۔

ہمارے جی کو قاہرہ پہنچ کر عجب طمانیت سی محسوس ہوئی جیسے اپنے گھر آ گئے ہوں، تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ ایک بستی سے اذان کی آواز آئی جس سے ہماری آنکھوں میں آنسو سے آ گئے۔ یہ کار یونیسکو کے دفتر نے ہمارے لیے بھیجی تھی لیکن ہمارے ہم سفر پاکستانی کو جس دوست کے ہاں ٹھہرنا تھا وہ انہیں لینے نہ آئے تھے لہٰذا ہم نے کہا بیٹھیے، پہلے آپ کو شریف پاشا الکبیر میں پہنچا دوں۔ ہمیں ہوٹل پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ ہم ان کوچہ و بازار کو نہ دیکھ لیتے تو

اصل قاہرہ سے دور رہتے۔ ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے لانبے چغے، سر پر پٹکے، کھڑ کھڑاتی بسیں اور ٹرامیں، حماچی، کباچی، حلوائی، نانبائی، کلیجے بیچنے والے، شوربہ فروش، گلیوں کے کونے کے چائے خانوں میں گپ مارتے۔ تاش کھیلتے۔ نردیں پیٹتے ہوئے لوگ، ٹریفک سگنل کی لال روشنیوں کو دھتابتاتے ہوئے ایک بڑھیا بازار میں اپنا گدھا لیے کھڑی تھی۔ اس پر سنگترے لدے تھے۔ بچّے ننگے پاؤں، ننگے سر دھاری دار عبائیں پہنے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے۔۔۔

تو گویا یہ تھا قاہرہ۔ ہوٹل گارڈن سٹی میں کمرہ نمبر ۴۲ کا دریچہ ہم نے کھولا تو عین سامنے دریائے نیل لہراتا نظر آیا۔ ہمارا دریچہ عین قصر النیل یعنی دریائے نیل کے بڑے پُل پر کھلتا ہے ہم نے اوور کوٹ اُتارا اور اسے تہہ کر کے سوٹ کیس میں سارے کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ تو نے انگلستان سے آسٹریا تک ہماری خدمت کی ہے۔ اب آرام کر، ہم بھی تو تجھے اپنے کاندھے پر اُٹھائے پھرے ہیں، جان سے لگائے رہے ہیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ جو رقم ہوائی اڈّے پر بھنائی تھی۔ قریب قریب ساری مزدوری اور بخشیش میں ٹھکانے لگ چکی۔ نیچے ہوٹل کے کاؤنٹر پر جس لحیم شحیم بیرے یا دربان نے ہمیں اہلاً و سہلاً کہا تھا وہ بھی کم از کم پانچ پیاسٹر کا حق دار تھا۔ لیکن جب ہم نے پچیس پیاسٹر کا نوٹ اسے دیا کہ اس کی ریز

گاری ہمیں دو تو اس کے پاس بمشکل آٹھ نو پیاسٹر نکلے۔ باقی کے عوض اس نے ایک زناٹے کا سلام اور تھینک یو ہمارے حوالے کیے۔ لیکن اب ہم مشرق میں تھے اپنے گھر میں تھے، شراب پینے اور سؤر کھانے والے کافروں سے دور۔ ہمارا جی بہت ہلکا اور کشادہ ہو رہا تھا، بالکنی میں نکل کر بیت کی کرسی پر بیٹھے اور ایک لمبا سانس لیا۔ اتنے میں ایک دستک دروازے پر ہوئی۔ یہ کوئی دوسرا چوغہ پوش بیرا تھا۔ بولا جناب بیئر لاؤں۔ ہم نے کہا۔ نہیں بابا معاف کرو۔ بولا وہسکی بھی ہے۔

ہم نے کہا۔ ہشت، اور وہ اپنی عبا لہراتا ہوا بھاگا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ایک کاغذ چپکا ہوا دیکھا۔ جس پر ہوٹل کے ریٹ لکھے تھے:۔

ناشتہ ۱۵ پیاسٹر

لنچ ۴۵ پیاسٹر

سینڈوچ پنیر کے ۵ پیاسٹر

سینڈوچ سؤر کے ۸ پیاسٹر

ہم سنگ اُٹھانے کو تھے کہ سر یاد آیا۔ کیا عجب ہمارے ملک کے ان ہوٹلوں میں بھی

جو ٹورسٹوں کے لیے ہوتے ہیں اس قسم کا التزام ہو۔

ہمارا قاعدہ ہے کہ کسی بھی وقت پہنچیں۔ ایک چکّر ہوٹل کے گرد و نواح کا ضرور کرتے ہیں اور چونکہ انسان ہیں، چوپائے نہیں ہیں، رستہ بھولتے بھی ضرور ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا کہ ٹیکسی والا بھی مشکل سے تلاش کر پاتا ہے اور عین اس روز ہمارے ہوٹل کے آس پاس کے گلی کوچے والوں کا حافظہ ایسا خراب ہو جاتا ہے کہ وہ ہوٹل اور سڑک کے نام سن کر مُنڈیا ہلا دیتے ہیں اور کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں ہم آشنا نہیں۔ رات کے دس ساڑھے دس بجے تھے لیکن ہم نکلے۔ آگے ایک بڑا چوک تھا۔ نام اس کا میدان التحریر۔۔۔جی خوش ہوا کہ اس ملک میں لکھنے والوں کی اتنی قدر ہے اس کے مقابلے میں کراچی کو دیکھیے کہ ہمارے نام پر ایک بھی سڑک یا چوک نہیں بلکہ گلی کے سِرے پر ہم نے جو ابن انشا اسٹریٹ کی تختی اپنے خرچ سے لگائی تھی وہ بھی کارپوریشن والے اُتار کر لے گئے۔ ہم یہ افسوس کر رہے تھے کہ ایک آشنا صورت نظر پڑی۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمٰی جا رہے تھے ہم نے کہا حضرت آپ کہاں؟ بڑے خلوص سے سلام دعا ہوئی اور باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ یہاں اہل علم کی قدر تو ہے لیکن میدان التحریر کا مطلب ہے لبریشن سکوئر۔ تحریر کا لفظ حریت کا رشتہ دار ہے۔ ہم نے کہا پھر محرّر، چنگی محرّر وغیرہ کا بھی یہی

مطلب ہوا کہ اپنے عمل میں آزاد ہیں، جس سے جو چاہیں وصول کریں۔ فرمایا۔ وہ بات اپنے ہاں کی ہے وہ تو یہ وضاحت کر کے چلتے بنے لیکن ہم چوک کی روشنیوں میں آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ اس چوک سے کوئی چودہ پندرہ رستے پھٹتے ہیں اور جس اونچی بلڈنگ کو ہم نے نشانی مقرّر کیا تھا ویسی ہمیں دس بلڈنگیں نظر آئیں۔

ہم نے اپنی سڑک کا نام تک یاد نہ کیا تھا کہ دور تھوڑا ہی جا رہے ہیں۔ ہوٹل کا نام بتا کر پوچھا تو سب نے کہا۔ یہ نام تو ہم نے آج ہی سنا ہے کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟ آخر ہم نے کہا لوگو۔۔۔ ہمیں دریائے نیل پر پہنچا دو۔ آگے ہم جانیں ہمارا کام۔ نیل پر پہنچے۔ وہاں سے نیل کے پُل پر پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری کھڑکی سے تو نیل آتا تھا لیکن نیل سے ہماری کھڑکی نظر نہ آتی تھی۔ آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری مشکل حل کی اور دروازہ کھول کر کہا۔ ”اندر بیٹھیے۔۔۔۔“ ہم بیٹھے لیکن ٹیکسی دس قدم جا کر یک لخت رک گئی۔ ہم نے کہا ”یا اخی! پٹرول ڈلوا کر چلا کرو۔ یوں مسافروں کو راستے میں نہیں رکھا کرتے۔“ بولا۔ ”جی پٹرول تو بہت ہے لیکن آپ کا ہوٹل آ گیا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ بات تھی تو تم انگلی کے اشارے سے بتا دیتے۔“

بولا۔ ”جی انگلی سے اشارہ کرنا یہاں بد تمیزی سمجھا جاتا ہے اور پھر ٹیکسیاں کاہے کے لیے ہیں؟ آپ لوگوں کی خدمت کے لیے ہی تو ہیں۔۔۔سات پیاسٹر۔“

اہرام کے سائے میں

ہر شام جب ہم اپنی بالکنی میں سے نیل کے اُس پار اور اِس پار قاہرہ کی روشنیوں کا سیلاب دیکھتے ہیں تو یادوں کے ظُلمات میں سے کُچھ چہرے اُبھرنے لگتے ہیں۔۔۔ اِن روشنیوں میں شاید وہ چراغ بھی شامل ہیں جن کے بغیر پاکستان کے بے شمار گھروں میں درد کا اندھیرا ہے۔ حمید ہاشمی کا شریر چہرہ۔ خالق قریشی کی مہربان مُسکراہٹ۔ ابو صالح اصلاحی پان کھاتے لطیفے کہتے، جعفر منصور۔۔۔ چلبلاہٹ کا بہتا دریا۔ ایم بی خالد زندگی کے عزائم سے بھرپور اور خالد ضیالودھی جس کے گھر سے ہمارے گھر کی دیوار ملی تھی۔۔۔ یہ سب لوگ پی آئی اے کے طیارے سے چلے تھے لیکن پہنچے نہیں۔۔۔

اے دوستو!۔۔۔ اے دوستو!

اور ابوالہول کی زبانی ہم نے آج شام کے جھٹ پٹے میں یہ بنکار سنی کہ میں لازوال

ہوں۔ دنیا موت سے ڈرتی ہے اور موت مُجھ سے ڈرتی ہے۔ میں اور خوفو کا یہ ہرمِ اعظم رہتی دنیا تک کھڑے رہیں گے۔ ابو الہول کو نہ اپنی ناک نظر آتی ہے نہ ہرمِ اعظم کا اکھڑا ہوا پلستر نہ خوفو کے تابوت کا خالی ظرف۔ سنگ و خشت اگر قائم بھی ہیں تو سنگ و خشت میں دھرا ہی کیا ہے جو موت اِدھر توجہ کرے۔

کبھی خزاں نے پلاسٹک کے پھولوں کو بھی تاکا ہے۔ اُسے تو تازہ اور شاداب گُل پسند آتے ہیں۔ پتھّر باقی ہیں اور ریت باقی ہے لیکن توت عنخ آمون۔۔۔ ملکہ

نفرتیتی۔۔۔ حسن کے تاجدار کہاں ہیں، عشق کے جانثار کہاں ہیں۔ جہاں بیٹھے ہم ابو الہول کی بنکار سن رہے تھے عین وہاں کھڑے ہو کر انطنی اور کلوپٹرا نے اہرام اور ابو الہول کو دیکھا ہو گا۔ یہیں سے ہیروڈوٹس نے اُن پر نظر ڈالی ہو گی۔ یہیں سکندرِ اعظم کے دندناتے قدم پڑے ہوں گے۔ ممفس کا شہر بسا اور اُجڑا۔۔۔ اور کل یہاں نپولین بونا پارٹ کھڑا تھا۔۔۔ یہ ریت اور ریت پر بنتے ہوئے مٹتے ہوئے قدموں کے نشان، ناموروں کے۔۔۔ ہم ایسے بے ناموں کے۔۔۔

شب کے اندھیرے میں اپنے آس پاس کی فضا کو ہم نے سرد آہوں سے بوجھل پایا۔ سسکیاں بھرتے سُنا اور ابو الہول برابر بنکار رہا تھا۔۔۔ میں لازوال ہوں۔ میں لازوال ہوں۔۔۔ یکایک سامنے دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ غور سے دیکھا تو ایک کتّے کو پایا جو کھنڈروں میں جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ اس نے ٹانگ اُٹھائی، ابو الہول کے مسند کی ابدیت پر پیشاب کیا اور ایک طرف کو نکل گیا۔ اپنی سال دو سال کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے۔

روشنی اور آواز کا یہ پروگرام قریب قریب ہر شام کو ابو الہول کے مجسّمے کے سامنے ہوتا ہے۔ چھُپی ہوئی روشنیاں ایک ایک کر کے اہرام اور ابو الہول کے پہلوؤں کو اجالتی ہیں اور پس منظر سے کمنٹری ہوتی ہے۔۔۔ ایک آواز۔۔۔ پھر دوسری آواز۔

پتھّر گھسیٹ کر لانے والے ہزاروں بے نام بے گاری مزدوروں کا شور سنائی دیتا ہے۔ سامنے مصری دیوتاؤں کے مندروں میں آرتی اُترتی ہے۔ نئے فرعون کی تاج پوشی کا جشن ہوتا ہے۔ باجے گاجے بجتے ہیں اور اس کے بعد اس کی میّت اُٹھتی ہے اور ماتمی نغمہ فضا میں پھیل جاتا ہے۔ ملکہ نفریتتی کا نقرئی قہقہہ گونجتا ہے۔ کاہن کی بھاری بھرکم آواز سُنائی دیتی ہے۔ صدیاں جاگتی ہیں اور ہماری گھڑیوں کے دقیقوں اور ساعتوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ تاریخ کے پردے اُٹھتے ہیں، گرتے ہیں۔ شہر بستے ہیں۔ اُجڑتے ہیں۔ دریائے نیل بپھرتا ہے، سمٹتا ہے، کونپلیں پھوٹتی ہیں اور فصلیں کٹتی ہیں۔ باپ اپنا ہرم بناتا ہے۔ بیٹا دوسرا ہرم بناتا ہے اور پھر غضب ناک ہجوم اُن کے تابوت کھول کر ان کی لاشوں اور ممیوں کو گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ ہم نے مصری عہد عتیق کے عجائب گھر بہت دیکھے، ہر جگہ دیکھے۔ لندن میں، جنیوا میں، لائیڈن میں، ویانا میں، ایمسٹرڈم میں۔ لیکن قاہرہ کے عجائب گھر کے سامنے گرد ہیں۔ یہاں جا کر اُن شاہانِ رفتہ کی عظمت و جبروت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ فرعون خاصے با سامان لوگ تھے۔ پھر ان کے معمار مہندس ستارہ شناس نقش گر منشی خوش نویس۔ زمانے کے سیلاب نے نیچے کی مٹّی اُوپر کر دی اور اُوپر کی مٹّی نیچے۔ اس سرزمین پر پھر یونانیوں نے قبضہ کیا۔ رومن اسے آ کر روند گئے۔ عثمانیوں کے گماشتوں نے

حکومت کی۔ انگریز چھاؤنی ڈالے بیٹھے رہے اور آج اسے اسرائیلیوں کے غول کا سامنا ہے۔

اہرام ہم نے تنہا جا کر دیکھے، جن صاحب نے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا وہ ٹال گئے۔ آخر میدان التحریر سے آٹھ نمبر کی بس پکڑی اور سامنے جا اُترے۔ ایک زمانے میں وہاں کھوے سے کھَوا چھلتا تھا۔ اب وہاں فقط دو سیاح تھے۔ ایک ہم، ایک کوئی جاپانی صاحب زادے۔ یا پھر اسکول کے لڑکوں کا ایک دستہ بیرون قاہرہ سے آیا ہوا تھا۔ اونٹوں والے اپنے اونٹ لے کر ہماری طرف بھاگے۔ گائیڈ بھی دوڑے دوڑے آئے۔ ایک نے ہمیں سب سے پہلے آلیا اور نعرہ لگایا۔

”جاپان ویری گڈ۔ انڈیا ویری گڈ۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم انڈین نہیں ہیں۔“

بولا ”پاکستان آلسو گڈ۔ کم آن۔“

یہ نعرہ اس کا اپنا نہیں تھا وہ اپنے ملک کی پالیسی بیان کر رہا تھا۔

”انڈیا ویری گڈ۔ پاکستان آلسو گڈ۔“
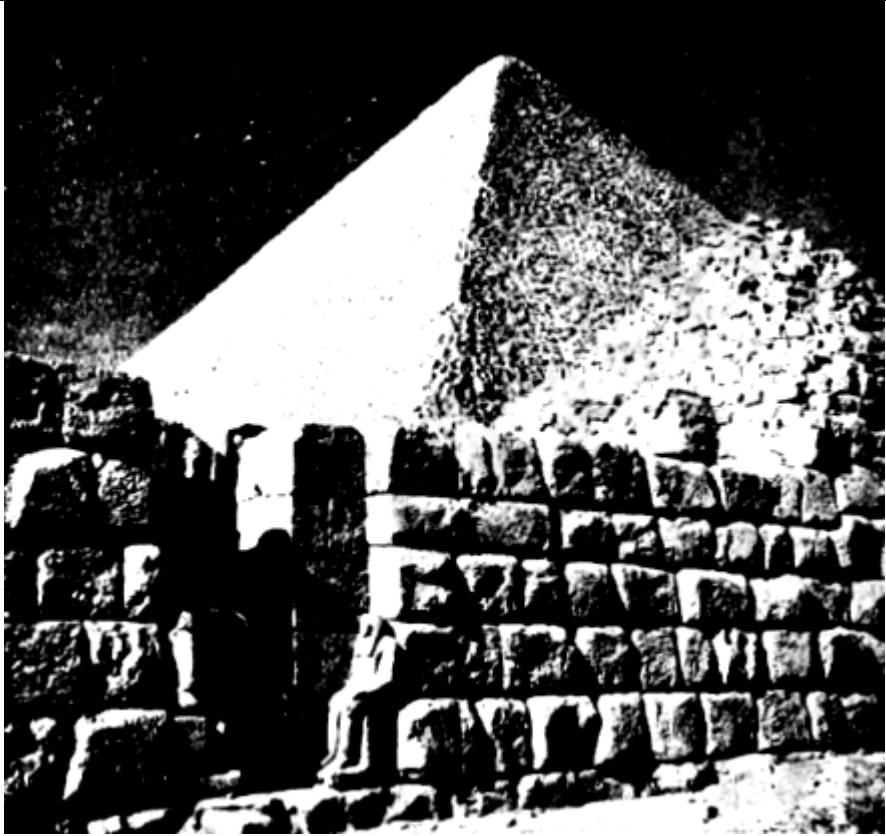
یہ سامنے خُوفُو کا ہرم ہے، سب سے بڑا۔ اس کی سطح چکنی نہیں ہے جیسی تصویروں میں نظر آتی ہے۔ ایک کے اوپر ایک تھوڑا ہٹا کر پتھّروں کا ردّا رکھتے گئے ہیں۔ بعد میں پلستر کر کے سطح ہموار کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ زمانے نے اُکھاڑ ڈالا۔ اب تو پاؤں رکھتے ہوئے اوپر جا سکتے ہیں۔ ہم اوپر تو خیر نہیں گئے لیکن اندر پہنچے۔

یہ راستہ جس سے اب اندر جاتے ہیں چوروں نے بنا رکھا ہے۔ جانے کس زمانے میں انہوں نے خُوفُو کے مقبرے کے جواہرات اور دولت چُرانے کے لیے نقب لگائی ہو گی اور اس میں کامیاب رہے کیونکہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب پہلی فرانسیسی مہم اندر داخل ہوئی تو انہوں نے تابوت کے ڈھکنے اور لاش کو غائب پایا۔ اس چور رستے کی اونچائی فقط اتنی ہے کہ آپ جھُک کر قریب قریب گھٹنوں کے بل اندر جاسکتے ہیں۔ آگے سارے رستے میں خاصی تیکھی چڑھائی ہے اور لکڑی کے تختے بچھا کر پاؤں ٹکانے کو پشتی بان لگا دیئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اوپر خُوفُو کے کمرہ تابوت میں پہنچے تو سانس چڑھ گئی تھی اور وہاں تازہ ہوا کو دخل نہیں تھا۔ سخت گرمی حبس اور ہوا کی کمی سے ہمیں اپنا دِل ڈولتا محسوس ہوا۔ جی چاہا بھاگ کر باہر نکل جائیں۔ آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں لیکن باہر جانا ممکن نہ تھا۔ باہر کا دروازہ اُن آدھ فرلانگ لمبی سیڑھیوں اور سُرنگ کے اس پار تھا۔ دوسرے لوگوں کے خیال سے ہم نے ارادہ مضبوط کر کے اپنے قویٰ اور اپنے سانس کو قابو میں کیا۔ ورنہ بے ہوش ہونے میں کسر نہ تھی بعد میں معلوم ہوا کہ محتاط لوگ اسی وجہ سے اندر نہیں آتے اور کمزور جسم و جان کے لوگوں کو تو وہاں آنا ویسے ہی منع ہے۔ ہم کمزور جسم و جان کے نہیں ہیں۔ لیکن غَلَطی یہ کی کہ سہج سہج اوپر چڑھنے کی بجائے یک دم تیزی سے

اوپر چلے گئے اور سانس پھلا بیٹھے۔

اس تجربے کے باوجود ہم دوسرے دونوں ہرموں کے اندر بھی جاتے اگر جاپاتے، لیکن شام کا جھٹ پٹا ہو گیا تھا۔ لہٰذا ابو الہول کی طرف جا اُترے جو نشیب میں ہے اور روشنی اور آواز کا کھیل شروع ہونے تک ہلٹن والوں کے ریستوران 'خُو فُو' میں بیٹھے کافی پیتے، کُچھ نہ کُچھ کھاتے ٹھونکتے رہے۔ پروگرام کا ٹکٹ خاصا ہے تیرہ چودہ روپے لیکن ہے دیکھنے کی چیز۔

ہم نے یہاں دو مصر دیکھے۔ پرانا مصر اور نیا مصر۔ پرانے سے مطلب فرعونوں کا مصر نہیں بلکہ ناصر سے پہلے کا۔ پرانی پود اور نئی پود۔ پرانی نسل چائے خانوں میں بیٹھی گپ کرتی اور چوسر کھیلتی اور دھوپ تاپتی۔ ہم نے تو لوگوں کو دِن کے دس بجے بھی کہ ہر جگہ ہر ملک میں کام کا وقت ہوتا ہے نردیں پیٹتے، تاش کھیلتے پایا۔ یورپ میں جہاں پانچ کاموں کے لیے ایک آدمی ہوتا ہے۔ یہاں ایک کام کو پانچ آدمی کرتے ہیں۔ دیکھا کہ چار آدمی سڑک پر جھاڑو دے رہے ہیں، پانچواں پیٹی باندھے ان کا داروغہ کھڑا ہے۔ سرِ بازار کھانے کی چیزوں پر گرد دھول مکھّیاں بھی کُچھ ہیں لوگ نان کو زمین پر رکھ دیتے ہیں اور پھر کھا لیتے ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے کُرتے، مٹّی میں گھسٹتے جارہے ہیں۔ ازہر کے آس پاس یا شریف پاشا الکبیر یا

میدانِ عقبہ میں جائیے تو سارا ماحول قرونِ وسطیٰ کا ہے۔ ہمیں الف لیلےٰ یاد آئی کہ اس کے کچھ قصّوں کا محل قاہرہ بھی ہے۔ کبڑا بونا بھی قاہرہ ہی میں تھا اور بوبک حجام اور اس کے سات بھائیوں کا قصّہ بھی یہیں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہم نے بھی ایک روز یہاں بال کٹوائے لیکن یہ اطمینان کر کے کہ اس شخص کو کوئی ایسی زبان نہ آتی تھی جو ہم سمجھتے ہوں۔ پھر بھی وہ بال کاٹتا گیا اور کُچھ نہ کُچھ قصّہ کہتا گیا۔ کوئی کوئی لفظ ہماری سمجھ میں آتا بھی تھا لیکن ہم نے ہونکارا نہ بھرا۔ ہم نے انگلی کی نوک دکھا کر بتایا تھا کہ بس ہمارے بال اتنے سے چھوٹے کرنا۔ زیادہ نہ کاٹ دینا۔ اس نے اتنے رہنے دیے باقی کاٹ کر ڈھیر کر دیے۔ ہم نے پھر بھی اُف نہ کی اور پیسے دے کر باہر نکل آئے۔ وہ شخص "اہلاً و سہلاً۔۔۔ اسرائیل۔۔۔ ناصر۔۔۔ جہاد" وغیرہ کرتا ہوا گلی کے موڑ تک ہمارے پیچھے آیا۔ بہت خلوص کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اور پھر دوسرا مصر ہے نوجوانوں کا۔ ان نوجوانوں کا جو کالجوں اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور ناصر کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ تعلیم یہاں مُفت ہے اور سب کے لیے دروازے کھُلے ہیں۔ تعلیم یافتگاں کو روزگار بھی لازمی طور پر ملتا ہے۔ فوجی تربیت بھی لازمی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں۔ ڈیڑھ سال تک اسے لازماً ٹریننگ لینی پڑتی ہے۔ دفتروں میں تیز طراز لڑکیاں کام

سنبھالے ہوئے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوروں کو کارخانے کی طرف سے دودھ ملنے کا حکم ہے۔ بڑی جائیدادیں ختم۔ بہت سے پیداواری ذرائع اب حکومت کے ہاتھ میں ہیں یا سیاسی پارٹی کی ملکیت یا امدادِ باہمی کے اداروں کی تحویل میں۔ یہی لوگ نئے مصر کی اُمّید ہیں۔ اس روز صدر ناصر نے پارلیمنٹ میں تقریر کی تو ریڈیو پر بھی نشر ہوئی۔ میدان التحریر میں اور سڑکوں پر اسے سننے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ لگے تھے اور صدر ناصر کی تقریر تھی بھی عمدہ۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمیں شکست نہیں ہوئی شکست اُسے کہتے ہیں جسے شکست مان لیا جائے۔ کیا ڈنکریک سے انگریزوں کے نکل جانے سے وہ جنگِ عظیم ہار گئے؟ لڑائی ہتھیار کی ہتھیار سے نہیں ہوتی بلکہ عزم کی عزم سے ہوتی ہے اور ہمارا عزم ناقابلِ تسخیر ہے۔ ہمیں کوئی ایسا فارمولا قبول نہیں جو ہمیں اسرائیل کو تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ ہم طاقت جمع کریں گے اور اسرائیل کو عربوں کے علاقہ سے نکالیں گے۔ جو چیز طاقت سے چھینی گئی ہے وہ طاقت ہی سے بحال کی جاسکتی ہے۔

صدر ناصر نے ان لوگوں کو بھی للکارا جنہوں نے ناجائز منافعوں سے جائدادیں بنا رکھی ہیں اور کہا سب کا محاسبہ ہو گا۔ سب کی مراعات اور استحقاق ختم۔ یہ محاسبہ صدر مملکت یعنی میری ذات سے شروع ہو گا۔

خان خلیل کی ایک شام

یورپ میں ہماری کم خوری اور غم خوری سب کی تلافی سر دار انور خاں نے کر دی۔ سر دار انور شاعر اور ہمارے پرانے دوست آج کل قاہرہ میں ہمارے سفارت خانے میں کونسلر ہیں۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ یہاں ہیں۔ پچھلی بار ملے تھے تو برازیل میں تھے۔ اب ملاقات ہوئی تو جیسا کہ پاکستان میں دوستی کے آداب ہیں انہوں نے کہا، چل کے کباب کھائیں گے۔ سر دار انور خاں کی دعوت میں خوشی خوشی جانے میں ایک نکتہ یہ تھا کہ ہم ان کو اپنی غزلیں سُنا سکتے تھے۔ سارا یورپ گھوم گئے کسی نے رسماً بھی نہ پوچھا تھا کہ صاحب اپنا کلام عنایت فرمایئے۔ شاعر پر یہ وقت بڑا کڑا ہوتا ہے وہ تین مہینے تک مکرّر اور واہ سبحان اللہ نہ سُنے تو اس کی شاعری کا پودا مُرجھانے لگتا ہے۔

بولے۔ ’’کیا کھاؤ گے؟‘‘
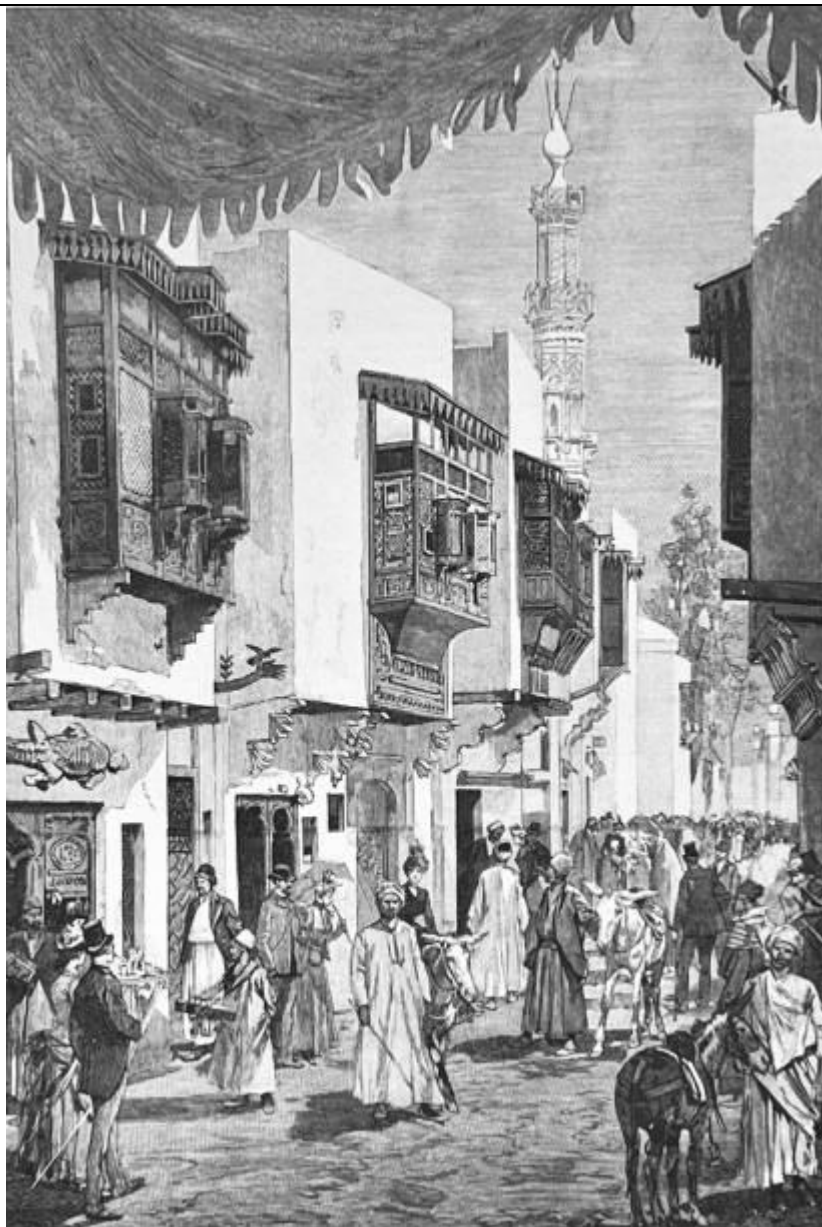
ہم نے کہا۔ ’’تکّہ کھائیں گے۔‘‘

بولے۔ ’’تکّے کو یہاں کباب کہتے ہیں۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’کباب بھی کھائیں گے۔‘‘

بولے۔ ’’کباب کو یہاں کوفتہ کہتے ہیں۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’کوفتہ بھی کھائیں گے۔‘‘ اب وہ چُپ ہو گئے کہ ہم نے اس کا مصری نام بتایا تو یہ اس کو بھی کھائیں گے۔ ہم نے بہت پوچھا کہ کوفتے کو یہاں کیا کہتے ہیں۔ وہ ٹال ہی گئے۔

اس شام ہم نے اتنا کھایا کہ پیدل چلنا دشوار تھا۔ وہ ہمیں ہمارے ہوٹل کے دروازے پر چھوڑ کر گئے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کچھ کسر نہ چھوڑی تھی۔ بیگم سجّاد حیدر نے ہمیں چائے پر بُلایا تھا۔ وہ جنگ پڑھتی ہیں اور ادب کا بھی وسیع مطالعہ رکھتی ہیں۔ سجّاد حیدر صاحب (ہمارے سفیر) بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان سے ہم نے ذکر کیا کہ ہم بغداد جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ فرمایا۔ وہاں تو جب جاؤ گے سو جاؤ گے۔ وہاں کی مٹھائی یہیں کھلائے دیتے ہیں۔ یہ لو یہ من و سلویٰ ہے۔

ہم نے کہا۔ ”آپ پر یہ کہاں سے اُترا ہے؟“

بولے۔ ”اُترا نہیں، ایک صاحب لائے تھے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہوائی جہاز سے لائے ہیں؟“

معلوم ہوا۔ ”ہاں۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر اُترا ہی کہنا چاہیے۔“

من و سلویٰ ہم نے منہ میں رکھا۔ اس کی اوپر کی تہہ نرم تھی اندر کی بہت سخت ہم نے کہا۔ ”من تو ہم کھا سکتے ہیں لیکن یہ اندر سلوا ہے کہ ڈی سلوا۔ یہ ہم سے نہیں چلتا۔ تب بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ یہ آپ کی قسمت میں نہیں ہے تو یہ سموسے کھایئے اور سردار انور خاں کی دعوت میں جانے تک ہم آدھی درجن سموسے کھا چکے تھے۔

اور اگلے روز عبدالباری انجم نے ہمیں کبوتر کھلائے۔

عبدالباری انجم جیسا کہ ان کا نام کہے دیتا ہے۔ شاعر ہیں۔ دس بارہ برس سے قاہرہ میں مقیم ہیں۔ ریڈیو پر چیف اناؤنسر ہیں۔ ہماری آمد کا معلوم ہوا تو ازراہِ مہربانی ملنے آئے۔ ہم نے کہا، ”میاں انجم۔ اب ہمارا ایک دِن باقی ہے۔ تمہاری یونیورسٹی

الازہر ہم نے دیکھ لی۔ اہرام کو سلام کر آئے لیکن صلاح الدّین ایوبیؒ کا قلعہ نہ دیکھا۔ محمد علی کی مسجد نہ دیکھی۔ کراچی کے لوگ ہم سے باز پرس کریں تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اپنا ایک دِن ہمارے ساتھ خراب کرو۔ ہم تمہارے شعر بھی سُنیں گے۔"

بولے۔ "بازار خاں خلیل بھی گئے آپ؟"

ہم نے کہا۔ "ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ لیکن پہلے قلعہ و مسجد۔"

اور وہ دِن اور وہ شام ہم نے پرانے قاہرہ کی گلیوں میں گزارا۔ فاطمیوں کے عہد کی مسجدیں۔ مملوکوں کے عہد کی مسجدیں رفیع الشّان پُر ہیبت اور پھر وہ قلعہ ہاں اِسی ڈیوڑھی کی اِسی محراب تلے سے صلاح الدّین ایوبیؒ اپنے سمند پر سوار گزرتے ہوں گے۔ ان فصیلوں پر ان کے سرہنگوں کی نشست ہو گی، قلعے کی شکستہ در و دیوار نے افسانے کہنے شروع کیے۔ سطوتِ رفتہ کے صلیبوں سے معرکہ آرائی کے اور نیچے اُن کے بھائی کی بنائی ہوئی مسجد ناصریہ کھڑی تھی اور پیچھے مقطم کی پہاڑیاں تھیں اور سارا قاہرہ دُور تک نظر آتا تھا حتّٰی کہ ایک جگہ سے نیل بھی جھلکتا تھا۔

قاہرہ کی پرانی مسجدوں میں سے جامع الازہر اور سیدنا حسین جہاں حسنین علیہ السّلام کا سر دفن ہونے کی روایت ہے اپنی الگ شان رکھتی ہیں۔ مسجد رفاعی ان سے الگ ہے۔ اس کے صحن میں چار بڑی محرابیں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں جن میں اسلام کے چاروں مسلکوں کے مدرسے تھے لیکن قلعہ ایوبی کے اندر محمد علی کی مسجد بالکل استنبول کی مسجدوں کے نمونے کی ہے۔ محمد علی پاشا، شاہ فاروق کا پر دادا تُرک تھا اور عثمانیوں کی طرف سے قاہرہ کا گورنر۔ لیکن پھر خود مختار ہو بیٹھا۔ اس کے خدام بھی تُرک تھے اور عربی نہیں جانتا تھا۔ اس مسجد میں استنبول کی مسجدوں کا شکوہ نہیں لیکن نمونہ وہی ہے اور پیچھے اس کا محل۔

یہ محل کوئی بہت رفیع الشّان نہیں لیکن اندر سے اچھا خاصا ہے۔ محمد علی پاشا کو مملوک سرداروں کی شورش کا بہت ڈر رہتا تھا کیونکہ جس گدّی پر وہ بیٹھا تھا وہ ایک وقت میں انہی کی تھی۔ آخر ایک روز اس نے ان کی دعوت کی۔ ناؤنوش کا دور چلا۔ ایک طرف شادیانے بج رہے تھے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مملوک سردار کھانا کھا کر ایک ایک کر کے ہاتھ دھونے کے کمرے میں جاتے تھے اور پھر واپس نہ آتے تھے کیونکہ وہاں جلّاد تیغہ لیے کھڑا تھا، جو داخل ہوتا تھا۔ اس کا سر قلم ہو جاتا تھا اور کوئی آواز ہوتی بھی تھی تو باجوں اور سازوں کے شور میں دب جاتی تھی۔ تین

سو آدمی تیغ کے گھاٹ اُترے فقط ایک بچا جو معاملہ بھانپ کر دیوار پھاند نکلا۔

اور ہم نے وہ ہال کمرہ دیکھا جس میں یہ دعوت ہوئی تھی اور وہ کمرہ دیکھا جس میں انہوں نے جامِ اجل نوش کیا تھا اور محمد علی کا مومی بُت صدر میں بیٹھے دیکھا جس کی دو بالشت لمبی سفید داڑھی تھی اور اس کے بیٹے ابراہیم پاشا کا بُت دیکھا جس نے نجد میں وہابیوں پر ستم ڈھائے تھے اور ان کی بغاوت کو کُچلا تھا اور پھر اس کے پوتے شاہ فاروق کو توند نکالے چشمہ لگائے کپری کے ساحل پر ایک حسینہ سے چہل کرتے دیکھا اور پھر اس کی گمنام موت کی خبر اخبار میں پڑھی۔

بازار خان خلیل جامع الازہر اور مسجد سیّدنا حسین کے عین سامنے واقع ہے۔ ٹیڑھی ٹیڑھی تنگ گلیوں کا گورکھ دھندا جو اِدھر جمالیہ کی طرف نکل گیا ہے۔ جمالیہ کا تعلّق جمال سے نہیں بلکہ جمل یعنی اونٹ سے ہے کیونکہ مصر کی عورتوں میں ہم نے خوبصورتی کا زیادہ رواج نہیں دیکھا۔ یہاں اونٹ اور ان کے محمل اور ان کے غمزے ہوتے تھے۔ اس میں ایک بازار زیورات بنانے والوں کا ہے۔ ایک کیسروں اور ٹھیٹھروں کا ہے۔ کچھ تسبیحیں اور مسی برتن بیچنے والوں یعنی نخاص کی سی گلیاں ہیں۔ بیچ بیچ میں لوکندے یعنی ہوٹل ہیں۔ اس زمانے میں چھتے ہوئے بازار ہوتے تھے۔ قاہرہ، دمشق، اصفہان اور بغداد میں ان کی باقیات اب بھی ہیں۔ خان خلیل

میں کُچھ محرابیں، کُچھ دروازے اور کُچھ کڑیاں اس بازار کی نشانی ہیں۔ اب یہاں ٹورسٹ آتے ہیں (عربی میں انہیں سیاح نہیں بلکہ سائح کہا جاتا ہے) اور حسبِ مقدور لُٹتے ہیں۔ جنگ کے بعد سے ان بازاروں میں رونق نہیں رہی۔ ہم ایسا کوئی بے سروسامان بھی گزرتا ہے تو بیس دکاندار لپکتے ہیں۔ ویلکم سر۔ سوویئز سر۔

میاں انجم کہ سامنے الازہر میں پڑھ کر عالم و فاضل ہوئے ہیں قیام بھی یہیں رکھتے تھے اس لیے بہت سے دُکانداروں سے ان کے اہلاً سہلاً اور تو تڑاق کے تعلّقات ہیں۔ قاہرہ کا محاورہ روزمرہ اہلِ حرفہ کی زبان سب خوب جانتے ہیں۔ دُکاندار ان کی وساطت سے ہمیں ادھار تک دینے پر آمادہ تھے لیکن ہم تحریص میں نہ آئے اور بھرے پڑے بازاروں سے بیگانہ وار گزر گئے۔ سیّدنا حسین سے اُدھر کو اس بازار میں داخل ہوں تو ایک پرانے زمانے کا بُڈّھا داہنے ہاتھ کی دوسری دُکان میں بیٹھا ملے گا۔ نسوار فروش ہے اور اس کی کائنات چند زنگ آلود ڈبّے ہیں۔ دنیا ومافیہا سے بے نیاز ان ڈبّوں کی طرف مُنہ کیے تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ ہم کئی بار خاص اسے دیکھنے کو اُدھر سے گزرے۔ وہاں کسی خریدار کو رُکتے نہ دیکھا۔ اس نے ہماری طرف بھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ پھر چراغ جلے اور ساری دُکانوں پر روشنیاں ہوئیں۔ اس کی دُکان پر روشنی بھی نہ ہوئی۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو الف لیلہ کے اس کردار کو

اسی طرح میلے کپڑوں میں سامنے نظریں ٹِکائے تسبیح کرتے پایا۔

انجم صاحب بولے۔ "دیکھ لیا بازار خان خلیل؟"

ہم نے کہا۔: "ہاں، اب تو فاختہ اُڑانے بلکہ فاختہ کھانے کو جی چاہتا ہے کیونکہ بھوک لگی ہے؟"

بولے۔ "فاختہ تو نہیں، کبوتر ملیں گے۔ اِدھر آؤ۔ عین الازہر کے سامنے سڑک کی نکّڑ پر بیٹھیں گے۔ کبوتر کھاؤ اور بازار کی سیر دیکھو۔"

اور اس نکّڑ کی دُکان کے سامنے باہر کرسیوں پر بیٹھے کبوتر کھاتے ہم نے قاہرہ کی آخری جھلکیاں دیکھیں کیونکہ اگلی صُبح ہماری رُخصت کی صُبح تھی۔ لوگ باگ آتے جاتے ہوئے چہلیں کرتے ہوئے۔۔ وہ ماچسیں بیچتا ہوا بُڈّھا جس کی ایک بھی ماچس ہمارے سامنے تو بکی نہیں وہ شخص جس نے اپنے گدھے پر مُولیاں بار کیے ہوئے کئی بار اس گلی کے چکّر کیے۔ آخری بار تو صرف دو گچھے رہ گئے تھے۔ ایک موٹی حسینہ دُکانداروں سے ٹھٹھول کرتی اور ہمیں آنکھ مارتی، اپنا لانبا کرتا گھسیٹتی چلی گئی اور شب کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ آپ قاہرہ جائیے تو ہماری طرف سے اس بُڈّھے کو ضرور دیکھیے کہ نسوار کی دُکان پر بیٹھا جانے کب سے تسبیح کیے جارہا ہے

اور یہاں کبوتر کھانے کو ٹھیکی لیجیے۔ پہچان اس کی یہ ہے کہ یہ بازار کا سب سے موٹا دُکاندار ہے، دِن بھر سامنے کرسی ڈالے اپنے لمبے کرتے میں بیٹھا ملے گا، ہمارے بیٹھے بیٹھے دس پانچ آدمی اور بھی اس کی ٹکّر کے گزرے۔ حتّٰی کہ بعض صنفِ نازک کے فرد بھی۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ مصری ایئر لائن، یونائیٹڈ عرب ایئر ویز کی سیٹوں کی پیٹیاں دوسری ایئر لائنوں کی نسبت دُگنی تگنی لمبی کیوں ہوتی ہیں۔

لبنان و شام

۲۹ نومبر تا ۵ دسمبر ۱۹۶۷ء

بیروت کی باتیں

سادھوؤں، سنتوں اور ولیوں وغیرہ سے ہمیں عقیدت تو ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ان کے بغیر نوالہ بھی نہ توڑ سکیں۔ لیکن یاروں کو تُجھ سے حالی کیا خوش گمانیاں ہیں۔ جنیوا کے ہوٹل St. Gervais یعنی ساں یروے کے بعد ہماری کوشش یہ رہی کہ لادینی یعنی سیکولر قسم کے ہوٹلوں میں رہیں۔ قاہرہ میں بھی جہاں لوگ اسلامیات کی سند لینے اور کباب تکّے کھانے جاتے ہیں ہمیں اطالوی عیسائیوں کے ایک ہوٹل گارڈن سی (جاردِن ستی) میں رہنا پڑا اور سپاگیٹی یعنی اطالوی سوّیاں کھانی پڑیں۔ بلکہ نہ کھانی پڑیں کیونکہ ہم انہیں چھُری سے اپنے کانٹے پر رکھتے تو تھے لیکن وہ منہ تک کانٹا آنے سے پہلے ہی پھسل کر پھر پلیٹ میں جا رہتی تھیں۔ اب یہاں بیروت میں۔۔۔

ہوا یہ کہ ہمیں یہاں پہنچتے ہی ہمارے میزبانوں میں سے ایک نے کہا کہ ساں بیل

ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ہم نے کہا ہم آ بیل مجھے مار کے قائل نہیں۔ ہمیں تو قاہرہ میں پروفیسر محمد حسن الاعظمی نے مشورہ دیا تھا کہ فندق سقفقور الجدید میں جانا۔ گھر کا سا آرام ملے گا۔ ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ اس نکتے پر زور نہ دیجیے۔ ہم ایسے بے شمار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں۔ جہاں گھر کا سا آرام ملتا رہا ہے۔ یعنی دروازے میں چابی نہیں لگتی۔ بستر کی چادر کئی کئی دِن نہیں بدلی جاتی۔ کوئی بیرا ہماری آواز پر کان نہیں دھرتا۔ ہمیں تو کوئی اچھا ہوٹل چاہیے گھر کا سا آرام مطلوب ہوتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں؟ یورپ کیوں آتے؟ لیکن پروفیسر صاحب کی تاکید یہی رہی کہ اسی ہوٹل میں جانا۔ واقعی آرام دہ ہے۔ سب سے بڑا آرام تو یہی ہے کہ سستا ہے۔

پس ہوٹل ساں بیل پر ہم نے اعتراض کیا کہ اس کے نام سے چوپایوں کی بو آتی ہے ہمیں یہ نکتہ بتانے میں خاصی دیر لگی اور خاصی لُغّت چھانٹی پڑی۔ لیکن پھر کسی نے لکھ کر بتایا کہ ساں بیل نہیں باں بعل۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے کسی لفظ میں ع یا ق یا ط ظ وغیرہ آ جائے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ عربی اور اسلامی چیز ہے اسی لیے پورس کے مقابلے میں ہمارا رجحان سکندرِ اعظم کی طرف زیادہ رہا۔ سکندرِ اعظم ہی نہیں ارسطو، افلاطون، بقراط، بطلیموس، فیثاغورث وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ مسلمان ہی جانا۔ ساں پر تو ہم نے غور نہیں کیا۔ بعل کی ع پر ہم چُپ ہو گئے لیکن جب ہم

ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو سینٹ پال کا ہوٹل ہے یعنی یہاں بھی کلیسا مرے آگے اب بیٹھو اور انجیل کا جاپ کرو۔ ممکن ہے ہم سینے پر صلیب کا نشان بنا کر اس وقت بھی رُخصت ہو جاتے۔ ہم ایسے گنہگاروں کا سینٹ پال جیسے برگزیدہ ولیوں سے کیا کام لیکن ایک تو ہم تھکے ہوئے تھے دوسرے عین اس کے احاطے کی دیوار کے ساتھ لائٹ ہاؤس یعنی المنارہ نظر آیا۔ چونکہ ان دِنوں ہم تقاضائے بشریت سے بہت کام لے رہے ہیں، یعنی راستہ فوراً بھولتے ہیں۔ اس لیے یہ نشان غنیمت معلوم ہوا۔ جہازوں کے لیے بنایا گیا ہے لیکن ہمارے بھی کام آ سکتا ہے۔ ہمارے نسیان کا حکیمی علاج بے شک یہیں ہے۔ کیونکہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں تاہم خیر۔۔۔

بعلبک کے ستون

دمِ تحریر رات کے دس بجے ہیں اور ہم سوٹ کیس میں اپنی فرنچ زبان کی ڈکشنری ڈھونڈ رہے ہیں۔ تا کہ ہاتھ منہ دھو سکیں۔ تفصیل مگس کے باغ میں جانے کی یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا ہمارے کمرے میں تولیہ کوئی رکھا ہی نہیں گیا۔ صابن ہم اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ لیکن تولیہ تو مسز البرز کے ہوٹل تک میں ملتا تھا۔ خواہ چار گرہ کا تھا۔ یہاں تو ہم نے کمرہ بھی ایسا لیا تھا جس کے ساتھ اپنا ذاتی غسل خانہ ہے۔ اگرچہ اس میں ٹب نہیں ہے اور شیشہ اتنا اونچا لگا ہے کہ ہم جیسے خاصے اُونچے آدمی کی صرف آنکھیں اس میں نظر آتی ہیں۔ شاید صرف بالوں میں کنگھا کرنے کے لیے رکھا گیا ہے تا کہ لوگ بے جا طور پر ہار سنگھار میں وقت ضائع نہ

کریں۔ ایک نظریہ ہمارا یہ ہے کہ یہ کمرہ داڑھی والے پادریوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم ایسے داڑھی مونڈنے والوں کے لیے نہیں۔ خیر صُبح اسٹول پر کھڑے ہو کر شیو کر لیں گے یا دِل کے آئینے میں خود کو دیکھ لیں گے۔ ہم اطمینان سے کپڑے اُتارے بیٹھے تھے تولیہ کے لیے ٹیلی فون اُٹھایا تو نیچے سے عربی سُنائی دی۔ آخر پتلون پہنی کوٹ پہنا۔ جوتا پہنا ٹائی لگائی اور نیچے ہوٹل کے دفتر میں گئے ہم نے کہا۔ "تولیہ چاہیے۔ ٹاول۔"

وہاں جو لڑکا تھا۔ بس بیٹھا رہا۔ بولا تو عربی بولا۔

بیروت میں عربی چلتی ہے اور فرنچ، عربی ہماری مذہبی زبان ہے اسے ہم دنیاوی کاموں میں لانا پسند نہیں کرتے اور فرنچ بے شک ہم بہت سی جانتے ہیں لیکن جس طرح اپنے کاغذات کو اپنے تھیلے اور کپڑوں کو سوٹ کیس میں رکھتے ہیں اس طرح اپنی فرنچ کی لیاقت کو بھی ہم نے اپنی ڈکشنری اور فرنچ بول چال کی کتاب میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ ذہن میں مختلف زبانوں کا ہجوم نہ ہو جائے اور مزید علم کے لیے اس میں گنجائش رہے۔ ہم نے لڑکے کو اشارے سے ہاتھ دھو کر دکھائے اس پر وہ صابن کی ایک ٹکیہ نکال لایا۔ ہم نے کہا یہ نہیں اور خیالی تولیہ سے اپنا جسم رگڑ کر دکھایا شاید وہ ہمیں ورزش کا شوقین سمجھا۔ کیونکہ الماری کھول کر ڈمبلوں کی ایک

جوڑی نکال کر رکھ دی۔ مایوس ہو کر ہم اوپر اپنے کمرے میں آئے۔ تھوڑی تلاش سے جرمن ڈکشنری مل گئی اور اس میں تولیے کے لیے Hand Tuch کا لفظ بھی نوٹ کر کے لے گئے کہ جرمنی آخر فرانس کا ہمسایہ ہے لیکن بے کار۔۔۔ اگر فرنچ ڈکشنری نہ ملی۔ شاید کہیں پولینڈ یا مصر میں ہم بھول آئے ہوں تو ہمارا حال قرونِ وسطیٰ کے پادریوں اور عیسائیوں کا سا ہو گا کہ نہانے دھونے کو مسلمانوں کی بدعت جانتے تھے۔ جسم سے پسینے کی بُو آتی تھی تو بس پوڈر چھڑک لیتے تھے۔ کل بازار جائیں گے تو یا تو تولیہ خرید لائیں گے یا پوڈر کا ڈبّہ۔ ان میں سے جو بھی چیز سستی ملی۔ کل رات اوپر کی سطریں لکھنے کے بعد ہم نیچے گئے تو آخر دفتر میں مونچھوں والے ایک پہلوان مل گئے جو شاید ہوٹل کے منیجر ہیں۔ تولیے کے ذکر پر لڑکے سے بولے۔

”ابے جا! لا کے تولیہ دے صاحب کو۔“

وہ مُسکراتا ہوا گیا اور کسی مٹکے میں سے ایک رومال سا نکال لایا۔ ہم نے کہا۔ ”اس سے تو ہم ایک کلہ پونچھ لیں گے دوسرے کا کیا کریں گے۔“ اس پر ایک اور رومال عنایت ہوا۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے اور پاؤں پھیلائے اور کہا ”ہمیں گرم پانی بھی چاہیے شیو کرنے کو اور بندہ بشر ہے کبھی نہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ

غسل خانہ کمرے کے ساتھ لگا ہو۔ اس نے کہا "اس قسم کی ہمہ وقت گرم پانی ملنے کی عیاشی تو ہلٹن وغیرہ میں ہوتی ہے ہم تو صُبح ساڑھے سات بجے کے بعد گرم پانی نل میں چھوڑتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔۔۔ "اچھا! آپ کی بڑی مہربانی، لیکن دیکھیے چھوڑیے گا ضرور۔"

صُبح آنکھ تو ہماری جلد کھل گئی لیکن لیٹے ساڑھے سات بجنے کا انتظار کرتے رہے لبنان میں اب گرمی نہیں ہے ہم اپنا موٹا سوٹ نہ پہنیں تو سردی لگتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ابھی تک ہمارے کمرے کے نلوں کی ٹینکی میں برف کی سِل ڈالتے ہیں۔ ہم نے ساڑھے سات بجے نل کھولا اور کھولے رکھا۔ کچھ فرق نہ پایا۔ آٹھ بجے کے قریب معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے برف نکالی اور اب خالی ٹھنڈا پانی رہ گیا لیکن ہم نہانے پر تُلے ہوئے تھے نہا کے رہے۔ اور یہ بھی ہم عرض کر دیں کہ شمعِ توحید کے پروانے ہونے کے باوجود یہ باقی ماندہ دِن غالباً ہم ہوٹل سینٹ پال میں گزاریں گے کیونکہ آج دوپہر مسلمانوں کے ہوٹل فندق سقنقور الجدید ہو آئے ہیں۔ یہ یہاں کے ڈاؤن ٹاؤن ساحتہ الشہدا میں واقع ہے۔ ڈھونڈنے میں خاصی دیر لگی کیونکہ ہر مکان کی ہر منزل پر ایک نئے ہوٹل کا بورڈ ہے۔ وہاں لی مارکیٹ کے نواح کا نقشہ نظر آیا۔ اتنی گندگی تو ہم برداشت کر لیتے ہیں۔ جتنی پاکستان میں ہوتی ہے

اس سے زیادہ کی عادت نہیں۔ غسل خانے کے کمرے کے ساتھ ہونے کی بات تو دور رہی۔ وہ تو دو مسافروں کو ایک کمرے میں رکھتے ہیں تا کہ باہم محبّت بڑھے۔ قدر عافیت معلوم کر کے ان کا کارڈ لے کر ہم آ گئے لکھا ہے۔ "یتو فر فیہ للمسافر کل اسباب الراحتہ نظافۃ خارقہ معاملت جیدۃ حمامات ضمن العزف باسعار لاتزاحم۔۔۔"

ہماری سمجھ میں اس میں سے فقط اسباب راحت اور حمام وغیرہ کے لفظ آئے یعنی وہ چیزیں جو ہم نے وہاں نہ پائیں۔

یہاں مشرق وسطیٰ میں ایک چیز البتّہ ہم نے ایسی پائی کہ ہمارا وطن واپس جانے کا اشتیاق کمزور پڑ گیا ہے۔ قاہرہ اور بیروت کے لوگ جوہر شناس ہیں۔ ہر جگہ ہمارا تعارف سیّد ابن انشاء کے نام سے ہوا۔ ہمارے ملک میں ذات پات کو لوگوں نے موروثی جاگیر بنا رکھا ہے۔ اگر آپ سیّد پیدا ہوئے ہیں تو آپ کو سیّد مانیں گے ورنہ نہیں۔ اچھے بھلے لوگ عمر بھر موچی کے موچی رہتے ہیں۔ ہم عالمِ عرب سے اپنے سیّد ہونے کی بہت سی اسناد اپنے ساتھ لا رہے ہیں کیونکہ منصفی کی جائے تو زیادہ مستند اِن لوگوں کا فرمایا ہوا ہے۔ سادات کا آغاز اِدھر کہیں عرب ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے لوگوں کو اس قسم کا حکم لگانے کا کوئی حق نہیں۔ انجمنِ ساداتِ امروہہ اور وظیفۃ المومنین وغیرہ کو چاہیے کہ ہمارے نام کی ممبری کی پرچی کاٹ

رکھیں ورنہ ہم آ کر فساد مچائیں گے۔ استغاثہ کریں گے اپنے ایسے تمام سیّدوں کو اپنے ساتھ ملالیں گے۔ پاکستان میں ان کی تعداد موروثی سیّدوں سے کم نہیں ہے۔

دمشق میں عشق

پہلی رمضان کی افطار ہمیں طرابلس الشّام میں صلیبیوں کے قلعے اور مسجد خالد بن ولید کے آس پاس ہوئی اور دوسری رمضان کے چاند نے ہمیں دمشق کی تنگ و تاریک محرابی چھتوں والی گلیوں میں گھومتے پایا۔

یہ دِن اتوار کا تھا اور بیروت میں بارش ہو رہی تھی۔ اپنی طرف سے تو ہم نے بہت جلدی کی لیکن ساحتہ البرج کے ٹیکسی والے کے لیے پہلی سواری ہم تھے اور باقی چار کی تلاش میں وہ ہمیں غچّہ دے رہا تھا کہ بس پانچ منٹ میں چلتے ہیں۔ اِس تاخیر پر ہم نے جو غصّہ اُتارا وہ انگریزی میں تھا۔ ہمارے جی کا غبار کُچھ دھلا اور ٹیکسی والا بے مزہ بھی نہ ہوا کیونکہ وہ یہ زبان نہ جانتا تھا۔ ہم نے کئی بار ٹکٹ واپس کرنے کی کوشش کی کہ کسی دوسری ٹیکسی میں چلے جائیں لیکن یہی زبان کی دقّت حائل رہی۔ ناچار ٹیکسی والے کے ساتھ ہم نے بھی مسافر ڈھونڈنے شروع کر دیے۔ کسی شخص

کو آتا دیکھتے تو آواز لگاتے ”دمشق، دمشق، اے بھائی دمشق، اے میاں دمشق چلو گے؟ ایک سواری دمشق کی۔“ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا ہمیں سخت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ دمشق اتنی اچھی جگہ ہے یہ لوگ جاتے کیوں نہیں۔ یہاں کیوں گھوم رہے ہیں۔ ہم دوبارہ اپنی انگریزی کی دھار تیز کر رہے تھے کہ تین عورتیں بظاہر بارش سے بچنے کے لیے سائبان کے نیچے آ کھڑی ہوئیں ایک موٹی اور خاصی عمر کی۔ دوسری جوان، گود میں بچّہ اور تیسری ایک لڑکی جسے دیکھتے ہی ہم نے فوراً حضرت شیخ سعدی سے کہ ہمارے غائبانہ پیر وہی ہیں فرمائش کی کہ یہ ہماری ہم سفر ہو اور لالچ بھی دیا کہ آپ کے نام کی پانچ پیسے کی ریوڑیاں بانٹیں گے۔ ہم ایسے مستجاب الدعوات کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ ہمارے معاملے میں دُعا کو اثر کے ساتھ اکثر دُشمنی رہی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس وقت بابِ رحمت غَلَطی سے کھُلا رہ گیا تھا یا حضرت سعدی ریوڑیوں کے پھیر میں آ گئے۔ اس لڑکی نے کہا۔ ”تین ٹکٹ دمشق کے“

یا تو ہمیں ایک لفظ عربی کا نہ آتا تھا یا پھر زبان ایسی رواں ہوئی کہ ہم راستے بھر یعنی دمشق تک مس فریال المدنی سے عربی میں باتیں کرتے گئے۔ اس کو انگریزی کے صرف دو لفظ آتے تھے۔ ”ویری نائس“ (بہت عمدہ) چنانچہ ہماری عربی پر بھی انہوں نے یہی برتے۔ بھلا ہو، مولوی محمد حسن کا۔۔۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ ان کو نوحؑ

کی عمر عطا کرے۔ ورنہ کم از کم اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ عربی پڑھاتے ہوئے ہمیں چودہ کے چودہ صحیفے ایک سانس میں دہرانے پر مجبور کرتے تھے۔ آج وہ کام آئے اور چند الفاظ عربی کے لا، نعم، اجل، جاء، نی۔ عن، شکراً، طیب وغیرہ نے بھی بڑی مدد دی۔ یہ شامی لڑکی تھی۔ یہ بادام سی آنکھیں اور یہ سیب کے سے گلابی گال۔ نقش موٹے موٹے تھے لیکن دِلآویز اور صحت مند اور مُسکراہٹ اور شیریں آواز تو ان نقوش میں عجب رنگ بھر دیتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ بچّے والی میری اخت ہے یعنی بہن۔ ہم نے کہا اور یہ بڑھیا تمہاری ماں ہو گی۔ بولیں۔ نہیں یہ میری خالہ ہیں۔ آگے چل کر ٹیکسی کو ایک گلی میں ٹھہرایا تو ایک شخص جس کے چہرے پر خشونت اور مونچھوں کی فراوانی تھی، سوار ہوا۔ یہ مس فریال کا بہنوئی تھا۔ اس کو دیکھ کر ہماری رطب اللّسانی میں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا۔ لیکن ہم نے ہتھیار نہ ڈالے۔ مس فریال دمشق میں طالب علمی کرتی تھیں۔ ہم نے کہا ہم بھی طالب علمی کرتے ہیں اور کاتب ہیں۔ کاتب حضرات بُرا نہ مانیں کہ ہم خوشنویسی اور غلط نویسی سیکھے بغیر ان کی صفوں میں گھُسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عربی میں کاتب ادیب کو کہتے ہیں خواہ وہ ہم ایسا بد خط اور شکستہ خط ہی کیوں نہ ہو۔ عربی بولتا پا کر ان کی خالہ بھی عربی کے ٹانکے لگانے لگیں۔ لیکن ہم نے اُن پر کچھ اعتنانہ کی زبان حال سے کہا

تو یہی کہا کہ چُپ رہو بڑی بی۔ ہمیں اتنی عربی نہیں آتی اور جو آتی ہے وہ فریال بانو کے لیے ہے۔ ہم فقط ماہ رخوں کے لیے مصوّری سیکھنے والے لوگ ہیں۔

بیروت سے نکلنے کے گھنٹہ بھر بعد جبل لبنان کی چڑھائی شروع ہو گئی اور پھر تو ہم اوپر تھے اور بادل نیچے وادی میں۔ سردی بھی شروع ہو گئی تھی۔۔۔ شطورہ نامی قصبے میں ٹیکسی رُکی اور یہ لوگ کہ روزہ رکھے ہوئے تھے کھانے پینے کی چیزیں پھل پھلاری وغیرہ خریدنے کے لیے رُکے۔ فریال نے ہم سے کہا۔۔۔ آپ کچھ نہ کھائیں گے۔ ہم نے کہا۔ ''نہیں۔'' بولیں۔ ''روزہ ہے؟'' ہم نے کہا۔ ''ہم سفر میں ہیں، روزہ نہیں ہے۔'' تھوڑی دیر میں ہم بھی نکل کر دُکان پر چلے گئے، اور اپنے لیے کُچھ سیب پسند کیے اور پیسے دینے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے بانو نے روک دیا کہ پیسے ہم دیں گے۔ ہم نے کہا ''اے جانِ قیس! تو چاہے تو ہمیں بے دام خرید سکتی ہے۔ پیسوں کا تکلّف نہ کر۔ لیکن نہیں۔ ہمیں یہ سیب قبول کرنے پڑے۔ فریال کی نشست ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ ہم تو پیچھے کھڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے ان کی بڑھیا خالہ کے سایۂ عاطفت میں۔ فریال آگے کی سیٹ پر ہمارے بالمقابل اس کے ساتھ اس کا قصاب نما بہنوئی اور پھر ڈرائیور۔۔۔ لیکن وہ لڑکی ایسی تھی کہ سارا وقت پیچھے کو منہ کیے بیٹھی رہی۔ بات بے بات اس ملائمت اور اپنائیت سے دیکھ لیتی تھی کہ

بس۔۔۔

بولیں۔ "کے روز رہو گے دمشق میں؟"

ہم نے کہا۔ "اے دخترِ شام، ہم مسافر ہیں آج رات چلے جائیں گے واپس۔ یا زیادہ سے زیادہ کل۔ کیونکہ اب ہماری واپسی کا دِن قریب آ رہا ہے۔ ہمارا دامن خیال مت پکڑ۔۔۔ اس قسم کی دلبری کا کُچھ فائدہ نہیں۔ لیکن وہ اس پر مصر رہی کہ دمشق سے آج مت جانا۔ کم از کم دو دِن رہنا۔۔۔ ہم نے کہا۔ اچھا جو حکم اس کے پاس اس کی تصویریں تھیں۔۔۔ ہم نے ایک مانگی تو اس نے اپنے بہنوئی کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا کہ اس سے خبر دار۔

اور پھر دمشق آ گیا۔ جہاں یاروں نے عشق فراموش کر دیا تھا۔ محض اس لیے کہ ذرا قحط سالی ہو گئی تھی۔

ہم دمشق کے چوک میں ٹیکسی سے اُترے ہی تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔۔۔

بغداد؟ بغداد؟

ہم نے کہا۔ "میاں ہم تو ابھی دمشق آئے ہیں تو ہمیں بغداد کیوں دھکیل رہا ہے۔

واں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے۔"

بولا۔"زیارت۔"

ہم نے کہا۔۔۔"لا"۔۔۔یعنی اگر زیارت کرنی بھی ہے تو تیری ضرورت نہیں۔

ہاں ہمیں فندق عدِن کا پتہ بتا دے۔ فندق عدِن کا نام ہمیں پروفیسر حسن الاعظمٰی صاحب نے قاہرہ میں دیا تھا اور اس کے مالک ایک سیالکوٹی ہیں۔ مدّت سے یہاں مقیم ہیں لہٰذا عبد اللہ ہندی کہلاتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات رہنی پڑی تو ان کے فندق میں رہیں گے ورنہ دُعا سلام تو کریں گے ہی۔ ان سے زیارت گاہوں کا پتہ مقام وغیرہ پوچھیں گے۔

اس شخص نے کہ نام تو اس کا سلیمان تھا لیکن شکل اس کی ہُدہُد کی تھی۔ ہم سے کہا۔ "فندق عدِن؟ اچھا میں بتاتا ہوں۔"

ہمارا خیال تھا وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتا دے گا یا چند قدم چل کر ہماری رہنمائی کر دے گا اور ہم شکراً کہہ کر آگے چل دیں گے لیکن اس نے ہمیں آگے چلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہم کافی تیز چلنے بلکہ بھاگنے والے آدمی ہیں۔ لیکن وہ تو ہُدہُد کی طرح پھُدکتا

ہوا چلتا تھا۔ چوک پار کر کے ایک گلی۔۔۔ ایک سے دوسری حتّٰی کہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور ہمیں لے گیا اور بولا:

"یہ رہا۔ فندق عدِن۔۔۔"

باہر لکھا تھا۔ "فندق قصر عدِن۔"

ہم نے اندر جا کر پوچھا۔۔۔ عبد اللہ ہندی صاحب ہیں؟

وہاں ایک صاحب بیٹھے حقّہ پی رہے تھے اور شاید شعر کہہ رہے تھے۔ بولے وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ آ جائیں گے۔ آپ کو کمرہ چاہیے؟ کمرہ لے لیجیے۔

ہمارے پاس سامان تو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم پھر آئیں گے۔

اب میاں ہُدہُد پھر سڑک پر پھدکنے لگنے۔ وہ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے۔

ہم نے کہا۔۔۔ "اے حضرت کدھر؟"

بولا۔ "جامع اُموی۔ سوق حمیدیہ۔"

ہمیں ان جگہوں پر جانا تو تھا ہی سوچا ٹھیک ہے کُچھ دے دیں گے اِسے۔ وقت بچے

گا۔ ورنہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سوق حمیدیہ یعنی دمشق کا قدیم بازار یہ سامنے ہے اور جامع اُموی اس کے عین پیچھے، میاں ہُدہُد ہمیں بازار میں لے جانے کا زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔ کبھی پشمینے والی گلی میں۔ کبھی زیورات والے بازار میں۔ کبھی سوویزز کی دکانوں پر۔ ہم نے کہا۔ "یا شیخ ہمیں کچھ نہیں خریدنا۔ جامع اُموی چل اور سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کے مقبرے چل اور حضرت بلال حبشی کی قبر پر لے چل اور مدرسہ عالیہ اور امام غزالی۔۔۔

یہ شخص بھیڑ میں ایسا طرارے بھرتا ہوا چلتا تھا کہ تعجّب ہوتا تھا یا پھریوں طرارے بھرتے ہم نے ایک پیر مرد ہفتاد سالہ کو قاہرہ میں دیکھا تھا جو اپنے لانبے کرتے اور سفید داڑھی اور عمامے میں سچ مچ کا نہیں بلکہ ہالی ووڈ کی کسی الف لیلیٰ قسم کی فلم کا کردار لگتا تھا۔ ایک زقند میں بیس سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ ہم میاں ہُدہُد کو بار بار بریک لگاتے تھے۔ "رفیقی لا تسرع۔ لا تسرع۔" یعنی میاں باندھ کے چل۔۔۔ لا تسرع (جلدی مت کر) کا لفظ ہم نے آج ہی سیکھا تھا۔ دمشق کے راستے میں ایک ٹرک ہمارے آگے آگے تھا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا جیسے ہمارے ہاں لکھا رہتا ہے "ہارن دے کر پاس کریں۔" یا "سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں" وغیرہ۔ مطلب ہم نے "لا تسرع" کا اس لیے نکال لیا کہ اس وقت ہمیں عربی آرہی تھی۔ ہم مس

فریال سے گفتگو جو کر رہے تھے۔ اب رہی سہی میاں ہُدہُد پر صرف ہو رہی تھی۔ اور آخر پہلے شکستہ محرابی دروازے نظر آئے۔ دیواریں بلا چھت کے۔ جانے یہ پرانے سوق حمیدیہ کی باقیات تھیں یا مسجد کا بابِ اول۔ اس کے بعد مسجد کا دروازہ۔ نعلین کو در بغلین کیا۔ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔ مسلمان؟ پاکستان؟ ہم نے جی میں تو کہا کہ میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اس نے تو!

لیکن بظاہر یوں گویا ہوئے کہ دریں چہ شک۔ الحمد اللہ۔۔ کیا ہم صورت سے مسلمان نہیں لگتے؟

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

”معتکف بودم بر مزار حضرت یحییٰ علیہ السلام در جامع دمشق“

یہ شیخ سعدی کی آواز تھی جو بچپن سے ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان الفاظ سے گلستان کی ایک حکایت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مزار صحنۂ مسجد میں نہیں بلکہ عین مسجد کے اندر چھت کے نیچے ہے اور سنگِ مرمر کی جالی سے گھرا ہوا ہے اور اُس پر ایک سبز گنبد ہے اور ہر چہار طرف ہمہ وقت کُچھ نہ کُچھ لوگ یہاں معتکف رہتے ہیں۔ ہم نے بھی یہاں چندے اعتکاف کیا۔ شیخ سعدی کے وسیلے سے شرحِ صدر کی دُعا مانگی۔ میاں ہُدہُد بھی ہمارے ساتھ دو زانو ہوئے۔ خدا جانے انہوں نے کیا دُعا مانگی ہو گی۔ ممکن ہے یونہی ہاتھ اُٹھائے ہوں۔ کیونکہ انہیں ہر سیاح کے ساتھ اُٹھانے پڑتے ہوں گے یا پھر یہ کہا ہو گا کہ یا مولا اِس اجنبی کے دِل میں آج شام سخاوت ڈال۔ اِس کے ہاتھوں اور بٹوے میں برکت دے۔ اُس کی دُعا تو اگر اس نے

یہی مانگی تھی ایک واجبی حد تک منظور ہوئی۔ ہماری دُعا کا نتیجہ ابھی نکلنا باقی ہے۔
مسجد کے اندر دو تین جگہ وعظ بھی ہونا تھا۔ مسند پر آلتی پالتی مارے ایک بزرگ
اسلام کی عظمتِ ماضی کا قصّہ کہہ رہے تھے۔ لوگ کھڑے، کُچھ بیٹھے سُن رہے تھے۔
بعضے اُٹھ کر دوسرے واعظ کے مؤکلین میں جا شامل ہوتے تھے جو شمالی جانب کے
دروازے کے قریب بیٹھا رمضان کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ چھت اونچی اور شان
دار ہے۔ لیکن زیادہ پرانی نہیں ہے کیونکہ اِس مسجد کو اُن صدیوں میں بارہا شکست و
ریخت اور طوفانِ غارت و آتش میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اب ہم جنوبی جانب کے
وسیع برآمدے میں نکل آئے اور جوتا پہن صحنۂ مسجد میں سے گُزر مشرقی دروازے
کی طرف آئے۔ گویا یہاں صحنِ مسجد میں جوتا پہنا جا سکتا ہے۔ مسجد کے مغربی
دروازے کے ساتھ امام غزالی کا مکتب تھا۔ ہم نے اپنے خضرِ راہ سے اُس کا نشان پوچھا
لیکن وہ کوئی تاریخ تھوڑی پڑھا تھا۔ اُس کا کام تو اڈّے سے مسافروں کو گھیر گھار کر
ہوٹلوں میں پہنچانا تھا۔ صحن میں پاڑ لگ رہی تھی۔ مرمّت ہو رہی تھی، اور بارش کی
پھسلن تھی اور ہمارے جوتے چکنے فرش پر رپٹے جا رہے تھے لیکن میاں ہُدہُد
ہمارے لا تسرع، لا تسرع پر کان دھرے بنا برابر لپکے جا رہے تھے۔ مشرقی
دروازے سے نکلیں تو باہر پھر اُونچی شکستہ محرابیں دِکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے ہلا کو

کی یورش بھی دیکھی ہو گی۔ تیمور کی بھی۔ یہیں وہ مشرقی منارہ ہے جس پر ایک روایت کے بموجب قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے۔ بائیں ہاتھ کو مڑیے تو سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کی تربت کا قبہ سامنے تھا۔ ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک بزرگ بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اُٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا اور سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سر نگوں تھے۔ جس نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسنِ اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جبکہ سرزمینِ شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دبار کھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحرا میں دربدر پھر رہے تھے، یہ فاتح لمبی تانے سو رہا تھا۔ ہم نے کہا اے غازی! اُٹھ کہ تُو اب نہیں اُٹھے تو کب اُٹھے گا۔ کیا خوب قیامت کا بھی ہو گا کوئی دِن اور؟

فاتحہ سے فارغ ہو کر ہم پھر نکلے۔ گھوم کر مغربی دروازے سے دوبارہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اب گائیڈ صاحب باہر کھڑے رہے۔ ہم نے پھر ایک بار نگاہوں کو اس رواق کہنہ کے نظارے سے سیر اب کیا۔ ایک بار پھر مزار حضرت یحیٰؑ پر بیٹھے اور تصوّر کیا کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی علیہ رحمتہ بھی یہیں کہیں معتکف ہوئے

ہوں گے اور اِس سامنے کے دروازے سے وہ لولا لنگڑا آدمی داخل ہوا ہو گا جسے دیکھ کر شیخ اپنے پاؤں میں جو تانہ ہونے کا غم بھول کر رب کا شکر ادا کرنے لگے کہ جو تانہ سہی میرے پاؤں تو ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا کہ ہوس کی تو انتہا نہیں۔ قسامِ ازل نے ہمیں پہلے ہی ہمارے حصّے سے زیادہ دے رکھا ہے۔ باہر میاں ہُدہُد اپنی لمبی چونچ نکالے ہمارے منتظر تھے۔ ہم ایک بار پھر سوق حمیدیہ کی طرف چلے اور اُس کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے اُسے کچھ دے دِلا کر رُخصت کیا کیونکہ ہم تو اِس شہر کے در و دیوار سے باتیں کرنے آئے تھے۔ یہاں سیاحت کے تحفے لینے نہیں آئے تھے۔ ہمیں حریر اور زری کے سامان نہ خریدنے تھے۔

بڑے بازار کی چھت تو قدیم نہیں ہے۔ اب تو اسے لوہے کی چادروں سے پاٹا گیا ہے لیکن ایک بغلی گلی میں ہمیں محرابوں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور ہم نے اس میں غوطہ مارا۔ اس وقت شام اُتر رہی تھی۔ روزہ دار اپنی دکانوں کو سمیٹنے لگے تھے۔ اندھیری گلیوں کو زیرو نمبر کے نیلے بلب ایک آسیبی سا اُجالا بخش رہے تھے۔ دہنی طرف کو ایک بڑا دروازہ نظر آیا۔ یہ مدرسہ ناصریہ تھا جس کی بنیاد سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کے بھائی سلطان ناصر الدّین ایوبی نے رکھی تھی آگے گلی اور تنگ ہو کر دہنی طرف

کو مڑ گئی تھی دونوں طرف کی بالکونیوں کے جھروکے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے یہ پرانے جھروکے اڑ داڑوں پر قائم تھے لیکن نیچے کی ڈیوڑھیاں اور محرابیں اور طاقچے سب قدیم تھے۔ چوبی دروازے بھی عہد پاستاں کی کہانیاں کہتے تھے، یہ تھا امویوں کا دمشق۔

دمشق اس وقت بھی آباد تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے دینِ حق کی منادی کی۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی یہ رونق پر تھا۔ آشوریوں اور ایرانیوں کے رایت بھی اس کی فصیلوں پر لہرائے اور سکندر اعظم کے بعد اہلِ مقدونیہ بھی یہاں اپنا سِکّہ چلا گئے۔ چودھویں سنہ ہجری میں خالد بن ولیدؓ کے ہمراہ عبیدہ بن جراح اور یزید بن ابی سفیان کے ہاتھوں یہ فتح ہوا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کی حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور ۴۰ھ سے یہ امویوں کا پایۂ تخت اور تمام دولِ اسلامیہ کا مرکز بن گیا لیکن یہ طرۂ امتیاز اس کی دستار میں فقط صدی بھر کو رہا۔ مصر میں خلافتِ عباسیہ منتقل ہونے کے بعد کبھی یہ مصر کے تابع رہا، کبھی بغداد کے۔ سلجوقیوں کی بعض شاخیں بھی اس پر کچھ دِن حکومت کر گئیں اور پھر ہلال وصلیب کے معرکے برپا ہونے شروع ہوئے۔۔۔

یہ مدرسہ ظاہر یہ ہے جس کے اندر ملک الظاہر کا مقبرہ ہے۔ یہ مدرسہ عالیہ ہے جہاں

ابن خلکان درس دیتے تھے۔ یہ مدرسہ افتائیہ ہے۔ یہ مدرسہ، ڈیوڑھیاں اور محرابیں۔ محرابیں اور طاق جن میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر ہیں اور ڈیوڑھیاں جن میں سے اندھی اندھی گلیاں جانے کِدھر نکل گئی ہیں۔ بظاہر گلی بند معلوم ہو گی۔ سامنے ایک مکان نظر آئے گا لیکن بس وہیں سے خم کھا کر کسی طرف کو نکل جائے گی اور پھر محرابوں کی بھول بھلیّوں میں گم ہو جائے گی۔ کہیں چند سیڑھیاں اور پھر ڈھلوان۔ گلی اوپر ہی اوپر اور پھر یک لخت نیچے اُتر جایئے۔ اس جھٹ پٹے میں ساری گلی میں بس ایک بچّہ کھڑا تھا۔ بولا ''مرحبا'' ہم نے کہا۔ ''جیتے رہو نونہال۔'' ان محرابوں کے بیچوں بیچ کولکیاں ہیں جن میں کہیں کوئی ٹین گر ہے، کہیں لوہے کا کباڑی ہے، کہیں کوئی درزی کپڑے سی رہا ہے، کہیں آگ پر سماوار چڑھا ہے اور سامنے کلچے پھیلے ہیں۔ ایک جگہ بغیر چراغ جلائے اندھیرے ہی میں ایک بُڈّھا موچی اپنے یا کسی اور کے جوتے میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اب روزہ کھُل گیا تھا۔ دُکانیں بند ہو گئی تھیں اور شیشے کے کواڑوں کے پیچھے لوگ میز کے گرد بیٹھے افطار کر رہے تھے۔ حمص یعنی کابلی چنے کی کھٹائی دار دال میں چمچہ چل رہا تھا۔ یہ دمشق تھا۔ مکتبوں کا دمشق۔ پرانی داستانوں کا دمشق۔ الف لیلوی دمشق۔ ایک گلی میں ہم نکلے تو بس ایک دُکان ایک بزاز کی کھلی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں بیٹھا حساب لکھ رہا تھا۔ سامنے

گلی کے اُس طرف ایک آدھی ڈھئی ہوئی گنبد دار عمارت کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا۔ ''کیوں میاں جی یہ مسجد ہے؟'' بولے ''ہاں۔'' ہم نے کہا۔ ''نام اِس کا کیا ہے؟'' معلوم ہوا۔۔۔ یہ سلطان صلاح الدّینؒ کے آقا سلطان نور الدّین شہید کی مسجد ہے اور اِسی کے اندر اُس کی تربت ہے۔ ڈیوڑھی بے چراغ تھی۔ ہم دبے پاؤں اندر گئے تو صحن میں بھی کوئی نہ تھا۔ ہاں صحن سے پرے ایک دروازہ تھا اس کے پیچھے شاید کوئی ہو گا۔ ہم نے وہیں سے فاتحہ پڑھی اور اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔

رات اُتر آئی تھی۔ چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو دیس۔ لیکن ہمیں کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم تو اِن گلیوں میں گُم ہو جانا چاہتے تھے، جذب ہونا چاہتے تھے۔ یہاں کسی گائیڈ کی حاجت نہ تھی۔ گائیڈ تو رستہ ڈھونڈنے اور پتہ رکھنے کے لیے ہوتا ہے گُم ہونے اور بھولنے اور اپنے آپ کو کھونے کے لیے گائیڈ کی کیا حاجت۔ اور پھر ہم اِن تاریک کیچڑ بھری گلیوں میں گم ہو گئے۔ کُچھ یاد نہ رہا کہ کِدھر کو جانا ہے۔ یہی گندی کیچڑ بھری گلیاں ہی تو ہمارے ماضی سے ہمارا رشتہ تھیں۔ ایک جگہ پھر کسی مدرسے کی اونچی ڈیوڑھی نظر آئی۔ ہم نے نام پڑھنے کے لیے ماچس جلائی لیکن کچھ نہ پڑھ سکے۔ گلی دور دور تک سنسان تھی۔ ایک جگہ چراغ جل رہا تھا۔ وہاں سے ایک آدمی ایک پیالہ لیے ہوئے نکلا اور پیشتر اِس کے کہ ہم اُس سے پوچھتے یا رفیقی یہ کون سا

مکتب ہے۔ دوسری گلی میں غائب ہو گیا اور پھر اندھیرے سے مسجد اموی کے مینار پیدا ہوئے اور ہم نے حساب لگایا کہ ہم اس کے جنوبی دروازے پر نکل آئے تھے۔ یہاں ایک چبوترہ تھا چبوترہ تو نہیں ایک نیچی دیوار تھی پرانے وقتوں کے کسی پُشتے کا حصّہ۔ ہم ٹھیکی لینے کو رُک گئے بیٹھ گئے۔

اور پھر اس پُشتے کے نیچے سے کوئی بولا۔ ”یہاں ایک مندر تھا میں اس مندر کی آخری اینٹ ہوں۔“ اس کے اوپر کارڈا بولا۔ ”میں اس کلیسا کی دیوار ہوں جو رومن قیصر آرکاڈیس نے اس مندر کی جگہ پانچویں صدی عیسوی میں بنایا“ اور پھر اس کے اوپر کے پتھّر بولے۔ ”ہم اس خانۂ خدا کے قدیم پتھّر ہیں اور ہمیں پہلی صدی ہجری میں ولید بن عبدالملک بن مروان نے یہاں جمایا تھا۔ بارہ ہزار کاریگر اور معمار اور سنگ تراش بلادِ روم سے آئے تھے اور شب و روز کام کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک سلطان، خلیفہ، پاشا، صوفی، درویش، متکلّم یہاں آکر سجدریز ہوئے۔“

ناگہاں شور سا اُٹھا۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ یورپ کے قہرمان صلیبی پرچم لیے منزلیں مارتے یہاں آ پہنچے تھے۔ یہ فرانس کے لوئی ہفتم کا لشکرِ جرّار ہے۔ وہ جرمن کے قیصر کوناڈ سوم کے زرّہ پوش نائٹ گھوڑے بڑھاتے آرہے ہیں۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ محاصرہ۔ محاصرہ۔ تیغوں کا رَن پڑتا ہے۔ منجنیقیں چلتی

ہیں۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر اور پھر یہ بادل چھٹ جاتا ہے۔ اب ایوبیوں کا دور دورہ ہے۔ سلطان صلاح الدّین اپنے سمند پر سوار تشریف لاتے ہیں۔ گلیوں میں ٹھٹ لگے ہیں۔ نقّارہ بجتا ہے۔ ایوبی پرچم کھلتا ہے اور کھلتا چلا جاتا ہے اور بیت المقدس کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے اور پھر یہ نقّارہ کسی اور قسم کے شور میں دب جاتا ہے۔ یہ کیا ہوا، یہ کیسے ہجوم ہیں۔ یہ سلطان غازی کی میّت لحد میں اُتاری جارہی ہے۔ کل من علیہا فان کل من علہیا فان۔۔۔ لیکن دیکھو یہ پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور گونجا۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ یہ ہلاکو خاں کی فوجِ بے اماں ہے۔ گلیوں، محرابوں، ڈیوڑھیوں کے دروازے بند ہو گئے اور پھر ہلاکو خاں فصیلیں چیر کر چڑھ آیا۔ اِس مسجد کو جلا دو۔ ڈھیر کر دو۔ یہاں ہماری مسند بچھا دو اور پھر مسجد کی چھت جلنے لگی۔ ڈھیر ہو گئی۔ دمشق کے آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور جب مطلع صاف ہوا تو ہلاکو بے نشان ہو چکا تھا۔ ایمان والوں نے مسجد پھر کھڑی کر دی تھی۔ ایک بار پھر مشرقی منارے سے پچاس مؤذنوں نے مل کر اذان دی۔ پھر مدرسے کھُلے۔

لیکن یہ دمشق تھا۔ ابھی اسے اور روندا جانا تھا۔ اب تیمور لنگ کی باری تھی۔ پھر فصیل شق ہوئی۔ طبل بجا۔ رایت کھُلا اور دمشق غارت ہوا اور پھر مسجد سے شُعلے بُلند ہوئے اور اس کی لنڈ منڈ محرابیں اور دیواریں باقی رہ گئیں۔ یہ لشکر لوٹا تو دمشق کے

بے مثال قالین بافوں کو بھی ہانکتا ہوا ساتھ لے گیا۔ اُن کو ماوراالنہر میں آباد کرو۔ دمشق کو اُجاڑ دو۔ لیکن مسجد پھر کھڑی ہوئی۔ دمشق پھر آباد ہوا۔ حتّٰی کہ سلطان سلیم اوّل نے اِسے تسخیر کیا۔ ایک کے بعد ایک سلطان کے نام کے خطبے یہاں پڑھے گئے اور آخر تُرکوں نے بھی گھوڑوں پر زینیں کسیں اور رُخصت ہو گئے۔ پھر ایک دھواں دھار جنگ ہوئی۔ پھر فرانسیسی ان گلیوں میں دندنانے لگے لیکن یہ محرابیں، یہ ڈیوڑھیاں یہ آثار کوئی نہ مٹا سکا۔ دمشق تو گنجِ شہیداں ہے۔ چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال حبشیؓ کے مزار پر۔ عبداللہ بن مکتومؓ کی تربت پر، عُمر بن عبدالعزیزؒ کی قبر پر، سیّدہ زینبؑ، سیدہ سکینہؑ، اسماء بنت ابو بکر، سیّدہ فاطمہ صغیرہ بنت امام حسینؑ۔ اِن قبرستانوں کے پھیلے ہوئے کھنڈروں میں کِس کِس موتی کو تلاش کرو گے۔۔۔ اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز آنی شروع ہوئی۔ اے دمشق رخصت۔ اے جامع اموی۔ اے عظمتِ رفتہ کی سجدہ گاہ السلام۔ لیکن ابھی کہاں۔ ابھی تو دمشق کی گلیاں باقی ہیں۔ ہم نے سڑک پار کی اور درویش پاشا کی تربت کے پاس سے کاواکاٹ کر پھر اندھی گلیوں کی محرابوں میں گُم ہو گئے۔

جونیہ سے طرابلس تک

یہ بیروت ہے اور یہ بیروت میں ہماری آخری شام ہے اور خدا کو منظور ہوا تو ہمارے سفر کی آخری شام بھی۔ بیروت کا طوفانی سمندر دو راتوں سے بے طرح شور کر رہا ہے اور ہمیں اپنے ساحل پر بُلا رہا ہے جہاں آج کل شام کو دور دور تک کوئی متنفّس نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی شاموں کو یہیں ہم نے لوگوں کے میلے دیکھے تھے۔ تربوز بھٹّے اور نان بکتے پائے تھے۔ آج نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں۔ نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں۔ یا تو موسم کے ساتھ رُخصت ہو گئیں یا چار دیواریوں میں، دیوان خانوں میں محصور ہو گئیں۔

شام ہے۔ تاریکی ہے۔ ابر ہے۔ بوندیں برس رہی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بادل بھی گرج اُٹھتا ہے اور اِس طوفان کے باوجود دور ابر کی دو ٹکڑیوں کے درمیان سے جانے کس تاریخ کا چاند جھانک رہا ہے۔

وہ سامنے حریصا کی پہاڑیاں نظر آئی ہیں اور اس کے دامن میں جونیہ قریہ ہے جہاں ہم نے پچھلے ہفتے ایک دِن گزارا تھا۔ مس حلا الشیخبی کہ یہاں ہماری رفاقت پر مامور ہیں اپنی کار لے آئی تھیں اور منزل ہماری المکتبہ البولسیہ تھی یعنی سینٹ پال پبلشنگ ہاؤس۔ سینٹ پال ہوٹل سے سینٹ پال مکتبے تک۔۔۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ سوئے دار کی رعایت سے اس مکتبے کی چھت پر صلیب بھی نصب تھی اور اس کے پیچھے کا پہاڑ بھی کلیساؤں اور صلیبوں سے پٹا تھا اور حویصا کے پہاڑ کی چوٹی پر ایک عیسائی دیوی کی بہت بڑی شبیہ تھی جس پر رات کو اس انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ سارے میں یہی چمچاتی دِکھائی دیتی ہے۔ دوسرے گرجاؤں کی صلیبیں بھی رات کو روشن ہو جاتی ہیں۔ کسی مسجد کا مینار ان پہاڑیوں پر ہمیں نظر نہ آیا۔

جونیہ میں ہم نے عین کنارِ بحر پر مہربان اور شفیق اور سیہ پوش فادر جورج بالیکی کے ساتھ کھانا کھایا اور لسّی پی۔ ہماری نظر جو فراز کوہ کی طرف اُٹھی تو بولے۔ چلو گے اوپر؟ ہم نے کہا: کیسے؟ بولے۔ بجلی کے جھولے میں بیٹھ کر۔ جھولے میں بیٹھ کر لوہے کی تاروں سے لٹکے پہاڑ چڑھنے اُترنے کے مواقع ہمیں جاپان میں بھی ملے اور سوئٹزرلینڈ میں بھی۔ لیکن ہم نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہاں ہم نے اپنا جی کڑا کیا

اور کہا: ہاں کیوں نہیں۔ فادر بالیکی کے ایک جوان ساتھی نے جھولے میں چڑھنے سے انکار کر دیا کہ مجھے تو ہول آتا ہے۔ مس حلا الشیخبی ہچر مچر کرتے ہوئے شرما شرمی ہمارے ساتھ سوار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے نیچے جھانکا اور زمیں کو سخت، آسمان کو دور پایا تو اُن کا دِل بھی ڈوبنے لگا اور خوف کے مارے ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم سے سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ مقام۔۔۔ ع

الٰہی یہ گھٹا دو دِن تو برسے۔۔۔

کی دُعا کا تھا۔۔۔ لیکن ہم جو جہاز میں بیٹھے کبھی نہ گھبرائے تھے۔ یہاں محض فادر اور مس حلا کو دِکھانے کے لیے ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ دِل ہمارا بھی بیٹھا جا رہا تھا۔ چڑھائی اتنی زیادہ اور مسافت ایسی خاصی ہے کہ اوپر سے یہ بھی مشکل سے نظر آتا تھا کہ ہم کہاں سے چلے تھے۔ اب ہم قلّہ کوہ پر تھے۔ فادر ہمیں پاس کے گرجا میں لے گئے جس کے اوپر لبنان کی سب سے بڑی مورتی ہے۔ اسے شہر بیروت کی محافظ کہا جاتا ہے۔ یہ گرجا عجیب و غریب ساخت کا تھا اور یہاں سے گرد و نواح میں بیس بیس میل دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ فادر نے صلیب کا نشان بنایا۔۔۔ ہم ہلال والے کھڑے دیکھتے رہے۔

جن پبلشروں سے ہم ملے اور بیروت کے پبلشر تو ایک صدی سے مشہور ہیں، ان میں سے بیشتر عیسائی ہیں۔ انہی نے پرانا عربی ادب چھاپا ہے اور اسلامی کتابیں بھی۔ یہ لوگ لبنان کے نولکشور ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہ کتابیں بہت خوبصورت چھاپتے ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے سفر نامے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے وہ مطبع الکاتولیکیہ اور مطبع آبائے یسوعیئین میں گئے تھے اور ڈھیروں کتابیں خریدی تھیں۔ ہماری عربی کسی قابل نہ تھی پھر بھی ہم نے کچھ کلاسیکی شاعروں کے دیوان لیے۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ بیروت کے دوسرے کاروباریوں کے بورڈ پڑھیے تو بھی غالب اکثریت عیسائیوں کی نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کا تناسب اب عیسائیوں کے برابر ہے۔ مولوی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں لکھا تھا کہ شہر میں مسلمان فقط ایک چوتھائی ہیں۔ عربی زبان سے محبّت اور اسرائیل کی مخالفت میں ہم نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے کم شمشیر برہنہ نہیں پایا۔ اگلے روز اِسی راستے ہم طرابلس گئے تھے۔ طرابلس دو ہیں۔ ایک طرابلس الغرب جو لیبیا میں ہے اور ایک یہ کہ امتیاز کے لیے طرابلس الشّام کہلاتا تھا۔ یہ لبنان کے انتہائے شمال میں ہے۔ اِس کے بعد شام کی سرحد پار کریں تو حلب کے نواح میں جا پہنچیں گے۔ اسی ساحلی سڑک پر جونیہ سے کچھ آگے ببلوس کا قدیم شہر ہے جہاں دنیا کے پہلے حروفِ

تہجّی ایجاد ہوئے اور زبان سے تحریر کا روپ پایا۔ لبنان قدیم زمانے میں فونیشیا کہلاتا تھا اور یہاں سے لوگ فنیقی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ یہ سمندری طاقت تھے اور ان کے سفینے روم اور کارتھیج تک مار کرتے تھے۔ ببلوس کے نئے شہر کے پہلو میں پرانے آثار میں سے کچھ تو چار اور پانچ ہزار سال پہلے کے مندروں کی باقیات ہیں جن کے گرد تین ہزار سال قبل مسیح کی فصیل کا کچھ حصّہ اب بھی کھڑا ہے عین ساحل پر ایک فرنیکش قلعہ ہے۔ صلیبوں کے زمانے کا۔ ولادت مسیح سے چار ہزار سال قبل یہ شہر سواحل فونیشیا کا دارالحکومت تھا اور بائبل کا نام اس شہر کے نام ببلوس سے مشتق ہے۔ اسے دنیا کا قدیم ترین شہر بھی کہتے ہیں۔

طرابلس کہ اصل میں تریپولی یعنی "سہ شہر" ہے۔ قدیم زمانے میں صدر "صید" اور ارداد تین شہروں کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور ہر جماعت علیحدہ محلّہ اور فصیل کے اندر رہتی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بڑا سربرآوردہ شہر تھا اور مسلمانوں کے عہد میں بھی۔ یہاں سے ریشم اور برتن دِساور کو جاتے تھے۔ سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ اور سلطان ببرس نے اس کا محاصرہ کیا۔ آخر سلطان قلاون نے اسے فتح کیا۔ یہاں صلیبی زمانے کا ایک قلعہ، ۱۷ جامع، بہت سے پرانے مدرسے اور کتب خانے،

بارہ پرانی عیسوی خانقاہیں اور تجارت کے بازار ہیں۔ نیا طرابلس تو جدید شہر ہے لیکن پرانا شہر اپنے مکتبوں، جامعوں اور محراب دار گلیوں کے ساتھ چھوٹا دمشق کہلانے کا مستحق ہے۔

ہم قلعے کے دروازے پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ کچھ بچّے کھیل رہے تھے۔ ان کی زبان ہمارے اور ہماری اُن کے پلّے نہ پڑی۔ اتنے میں ایک نوجوان واسکٹ پہنے آتے دکھائی دیئے۔

ہم نے پوچھا۔ "انگریزی بولتے ہو؟"

جواب ملا۔ "ہاں بولتا ہوں۔۔۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی انگریزی آٹھ دس لفظوں تک محدود تھی۔ نام ان کا احمد تھا۔ بولے اُردُو بھی بول لیتا ہوں۔۔۔ ہم نے کہا: "بولو" فرمایا۔ "بہت اچھا۔" پتہ چلا کہ اُن کو یہی لفظ آتا ہے۔ "بہت اچھا"۔ جانے کہاں سے سُنا تھا۔

یہ بے چارے بہت بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے قلعے کے دروازے پر جا کر بابا علی کو بہت آوازیں دیں لیکن آج بابا علی نے پہلا روزہ ہونے کی وجہ سے جلد دروازہ بند کر

دیا تھا۔۔۔ احمد میاں نے کہا: ”اب آپ شہر جایئے، چھ بجے کے بعد آیئے۔ اُس وقت بابا علی کا جی چاہاتو آپ کے لیے دروازہ کھول دے گا۔ آپ ایک آدھ لیر انذر کریں تو دروازے کا کھلنا بڑی حد تک یقینی ہے۔“ ہم نے کہا۔۔۔ ”اچھا، اب ہمیں بازار کا رستہ بتاؤ۔“ بازار تو ہم پہنچ گئے لیکن وہ بھی بند ہو رہا تھا۔۔۔ طرابلس کی یادگار کے طور پر ہم نے کُچھ خریدنا چاہا۔ سامنے کمبلوں کی دُکان تھی۔ ہم نے ایک کمبل لیا۔ بھاؤ تاؤ کی گنجائش نہ تھی کیونکہ دُکاندار افطار کے لیے گھر جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔۔۔ ”بھاؤ تاؤ کرنا ہے تو کل صُبح آئیو۔۔۔“ ناچار ہم نے پیسے دیے اور کمبل کو بغل میں مارا۔ یہاں میاں احمد بھی سلام علیک کر کے ہم سے رُخصت ہو گئے اور ہم طرابلس کی گلیوں میں گھومنے کے لیے تنہا رہ گئے۔

اس مسافت میں ہمارا کمبل بہت خلل انداز ہوا۔ ہم اسے ایک بغل سے دوسری میں منتقل کرتے رہے حتّٰی کہ ایک بار تو ہم اِسے چھوڑنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے لیکن اب یہ ہمیں نہ چھوڑ رہا تھا۔ طرابلس میں دیکھنے کی چیزیں تو بہت ہیں لیکن وقت کہاں تھا۔ مدرسوں اور مسجدوں اور محرابی بازاروں میں تو ہم جھانکے اور دور دور تک گئے لیکن قلعہ نہ دیکھ پائے۔ معلوم ہوا صُبح دم دروازۂ خاور کھُلے گا تو یہ بھی کھلے گا۔

چل خسرو گھر، اپنے سانجھ بئی چو دیس۔۔۔ یہ تین مہینے بڑی مشکل سے تمام ہوئے

ہیں اور ہم بغداد کا پروگرام منسوخ کر کے سیدھے کراچی آ رہے ہیں کیونکہ اے ہماری کلفتوں، عشرتوں اور حسرتوں کے شہر، ہم تُجھ سے دور نہیں رہ سکتے۔ آوارہ گردی سے ہم نے اپنے دامن میں دیس دیس کی خاک تو جمع کرلی ہے لیکن ہمارے درد وہی ہیں کہ جو تھے اور درماں وہی ہیں کہ جو تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی دیکھا۔۔۔ یہ دریائے سین ہے۔ یہ ٹیمز ہے۔ یہ مین ہے۔ یہ رائن۔ یہ ایمسٹر۔ یہ رہی جنیوا کی جھیل اور یہ ہے زیورخ کا بحیرۂ دریائے ولتاوا۔ دریائے دستا۔ دریائے ڈینیوب۔ دریائے نیل اور اب بحیرۂ روم۔ پانی ہی پانی۔ اِس کے باوجود پیاس ہی پیاس۔ یہ کیا صدا کانوں میں آ رہی ہے۔ گرجا کا گھڑیال ہے یا بانگِ رحیل ہے۔ اے مسافر اپنے آخری پڑاؤ سے اُٹھ۔۔۔ الاؤ بجھا اور کجاوے میں زادِ سفر رکھ کہ آج تیرا قافلہ جاتا ہے۔ اے بلادِ مغرب کے شہرو، خدا حافظ۔ اے پیرس کے چوکو، لندن کی گلیو۔ برلن کی سڑکو۔ ایمسٹرڈم کے بازارو، جنیوا کے منارو، برن اور لوسرن کے سبزہ زارو، پراگ کے قلعو، وارسا کے خرابو، ویانا کی محل سراؤ، قاہرہ کی مسجدو، دمشق کے مکتبو اور طرابلس کی محرابو الوداع اور بیروت کی روشنیو تمہیں بھی الوداع۔

آج ہم اپنے سفر کی بارہویں ولایت اور ستائیسویں شہر کو خیر باد کہیں گے۔ اے

وقت تیز ترک گامزن۔ اے گھڑی کی سوئیو۔ چلو چلو نسیم خوش دلی از فتح پور می آید۔ بس ایک شام اور درمیان ہے۔ پھر ہم اپنی کمر کھولیں گے۔ جوتوں سے اِن رہ گزاروں کی گرد جھاڑیں گے۔ مسافرت کے دِنوں اور ہم سفروں اور مہربانوں اور میزبانوں کو یاد کریں گے۔ صعوبتوں کو بھُول جائیں گے۔

مدرسہ اور مدرسہ کے شاگرد دمشق میں

چل خسرو گھر اپنے

ایک بار ہمارے دوست ممتاز مُفتی کے راولپنڈی سے کراچی آنے کا پرچہ لگا۔ تو ہم نے اور احمد بشیر نے ان کے خیر مقدم کے لیے لارنس روڈ سے کلن بینڈ والے کا باجا کرائے پر لیا۔ پوری ٹیم لینے کی تو مقدرت نہ تھی، نہ ہمیں خود ڈھول پیٹنا اور نفیری بجانا آتا ہے۔ بس ایک آدمی کی فیس دی۔ اس نے تُرت مٹکے میں سے نکال کر اپنی زرق برق جھالر دار یونیفارم زیبِ تن کی اور ہمارے ساتھ ہو لیا۔۔۔ یہ باکمال ایک ہاتھ سے ڈھول بجاتا تھا، دوسرے میں ترم پکڑے تھا۔ یہ تو دو ساز ہوئے۔ یورپ میں تو جہاں لیبر مہنگی ہوتی ہے گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول کا حساب ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک آدمی تین تین چار چار باجے ایک ساتھ بجاتا ہے۔ منہ والا باجہ ہاتھ سے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈھول کے ساتھ ایک کمانی لگی ہے اس میں وہ اٹکا رہتا ہے۔ ایک ذرا گردنِ جھکائی اور پھونک لگا لی۔ اب دونوں ہاتھ فارغ ہیں۔

ایک سے ڈھول پر چوٹ لگائیے۔ دوسرے سے جھانجھ بجائیے یا سر کھجائیے۔

بہر حال مُمتاز مُفتی صاحب اس جلوس میں اِس ایک نفری بینڈ کے پیچھے دولہا بنے جو چلے تو یہ منظر دِیدنی تھا۔ ہوائی اڈّے کے سارے مسافر دیکھنے کو جمع ہو گئے کہ اِس کروفر سے یہ کس کی سواری بادِ بہاری جاتی ہے۔ یہ اعزاز ہماری نظر میں پنڈی سے آنے والوں کا تھا۔ ہم تو پھر ولایت سے آ رہے تھے اور یاروں دوستوں کو لکھ دیا تھا کہ دیکھنا زیادہ تکلّف نہ کرنا۔ یہ زیادہ ہار گجرے ڈھول تاشے سپاس نامے وغیرہ ہمیں پسند نہیں۔ اگر ہوں، تو بس ایک حد کے اندر ہوں۔ زندہ باد کے نعرے لگانے والوں کا جلوس بھی زیادہ سے زیادہ ایک بس میں آ جائے۔ ہم گوشہ گیر فقیر آدمی ہیں۔ زیادہ طمطراق ہماری درویشانہ طبیعت کے منافی ہے۔ جنگ والے، ڈان والے اور ٹیلی وژن والے بھی بس ایک ایک فوٹوگرافر ہماری تصویر وغیرہ لینے کو بھجیں۔۔۔ ہجوم سے ہمارا جی گھبراجاتا ہے۔

پھر واپس آنے والوں کے خیر مقدم کے کئی طرح کے کلمات ہم نے پڑھے اور سُنے تھے۔ خوش آمدید، صفا آور دید، اے آمدنت باعث آبادی ما۔۔۔ سروسوئے بوستان آید ہمے، اہلاً وسہلاً، جی آیاں نوں وغیرہ۔ ہمارا دِل بھی کراچی کے قریب پہنچ کر گداز ہو گیا تھا اور ہم نہایت رقّت سے آیا ”شہر بھنبھور آیا شہر بھنبھورنی“ گاتے اور آنسو پونچھتے چلے آ رہے تھے۔ اس بے تکلّفی کا بُرا ہو۔ اوّل تو احباب میں

سے کوئی ہوائی اڈّے پر آیا نہیں، آیا تو بنکارا۔ ”جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے۔“ دوسرا بولا۔ ”خیر سے بُدھو گھر کو آئے۔“ ایک شاعر نے تو ایک پرانے فارسی مصرعے۔۔۔ ”چو بیاید ہنوز۔۔۔ الخ“ سے تاریخ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ غنیمت ہوا کہ نہیں نکلی۔ یہ ساراجی جلانے کا سامان تو تھا لیکن جب ہم نے پوچھا کہ لوگو باجے گاجے کہاں ہیں۔ جلوس کدھر ہے کیا ایک آدھ ہار بھی تم نہ لا سکتے تھے۔ پیسے ہم دے دیتے۔ یہ کیا تماشا ہے تو سب آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے۔ کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے سکے۔ خیر میاں آزاد۔ آج کل کے دوست ایسے ہی ہیں۔ ان کا گلہ نہ کرنا چاہیے۔

لیکن آنے والی جوئے کم آب کو سب سے پہلے کسٹم کے پُلوں کے نیچے سے گزرنا پڑا۔ ہمارے پاس ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک اور سوٹ کیس۔ ایک تھیلا ایک اور تھیلا اور ایک اور تھیلا۔

کسٹم افسر نہایت مستعد آدمی تھے۔ فرمایا۔

Have you anything to declare?

ہم نے کہا۔ ”ہم خدا کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتے ہیں کہ گذشتہ راصلوۃ بقیہ عمر

ملک اور قوم کی خدمت میں بسر کریں گے، خواہ اس کے لیے ہمیں اسمبلی میں کیوں نہ جانا پڑے۔

بولے۔ ”اس قسم کے اعلان سے مُجھے کوئی دلچسپی نہیں میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے سامان میں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو قیمتی ہو جس پر کسٹم لگتا ہو۔“

ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں بڑی بڑی انمول چیزیں ہیں۔“

ہم نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی۔ یہ تھی انگلش جرمن اور جرمن انگلش ڈکشنری۔

بے توجہی سے دیکھ کر فرمایا۔ ”اور کیا ہے؟“ اب کے ہم نے ہاتھ ڈالا تو فرنچ انگلش اور انگلش فرنچ ڈکشنری دستیاب ہوئی۔

فرمایا۔ ”اس کے نیچے کیا ہے؟“

وہاں سے ڈچ زبان کی لُغّت بر آمد ہوئی۔

اب انہوں نے تھیلا لے کر خود ٹٹولا۔ اس کے نیچے چیک زبان کی لغت تھی۔ پولش زبان کی روزمرہ بول چال کی کتاب تھی۔ اٹالین زبان کی گرامر تھی۔

بولے۔ ''بس؟''

ہم نے کہا۔ ''بس کیوں عربی زبان کے لُغّات اِس دوسرے تھیلے میں ہیں۔ ان کے علاوہ ہر شہر کی گائیڈ بُک، نقشہ اور پکچر کارڈ ہیں، دکھائیں نکال کر؟''

بولے۔ ''نہیں۔''

اب انہوں نے ہمارے سوٹ کیس کا ٹھوکا دیا اور کہا یہ بھی ذرا دیکھیں۔

وہاں بس کچھ کپڑے تھے ہمارے کچھ پرانے کچھ نئے۔۔۔ دُھلی اَن دُھلی بنیانیں موزے وغیرہ۔ مولوی محبوب عالم کا سفر نامہ۔ ہمارا غیر مطبوعہ دیوان۔

ایک ڈبّہ ہم نے اِن کپڑوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا اس پر کسی کی نظر نہ جائے گی لیکن کسٹم والوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ انہوں نے اسے کھینچ لیا۔ ہم نے کہا۔ نہ نہ۔ اِسے مت کھولیے گا۔ اس میں کُچھ بھی نہیں ہے لیکن انہوں نے کھول ہی لیا۔ اس ڈبّے کے اندر سے ایک اور ڈبّہ نکلا۔۔۔ اُس کے اندر ایک اور۔۔۔ ایک اور۔۔۔ اب لفافے شروع ہوئے۔ ایک کے اندر دوسرا۔۔۔ دوسرے کے نیچے تیسرا۔۔۔ بڑے لفافے۔۔۔ درمیانے لفافے۔۔۔ چھوٹے

لفافے۔۔۔ سب سے اندر کا لفافہ انہوں نے کھولا۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔

فرمایا۔ ’’اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

ہم نے کہا۔ ’’کیوں نہیں ہے؟ آنکھوں والوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ ہم سے پوچھیے، ہم جاتے ہوئے اپنے ہاں کی ہینڈی کرافٹ شاپ سے کچھ تحفے لے گئے تھے، اِن لوگوں نے اخبار میں براؤن پیپر میں باندھ کر دیے تھے۔ ہمیں بہت شرم آئی۔ اب یہ دیکھیے، یورپ والے کتنی عمدہ پیکنگ کرتے ہیں۔ اس ڈبّہ میں ہمارا سوٹ تھا اور اس دوسرے میں جوتا تھا۔ باقی لفافوں میں ہماری قمیصیں اور سوئیٹر وغیرہ تھے۔ اِس لفافہ میں ہم ایک بار ڈبل روٹی لائے تھے۔ لوگ تو ایسی چیزیں بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں، ہمارے جی نے یہ گوارانہ کیا۔ سینت سینت کر رکھتے رہے۔ اب یہ چیزیں ہم اپنے دُکانداروں کو دکھائیں گے اور شرم دِلائیں گے کہ تم لوگ ایسے ڈبّوں اور لفافوں میں چیز رکھ کر دیا کرو تو ہم کیوں نہ لیں۔ جب ہم ولایت میں اتنی ڈھیر ساری خریداری کرتے ہیں تو یہاں کے دُکاندار تو پھر اپنے بھائی ہیں، اپنے گرائیں ہیں۔۔۔ یہ سارے ڈبّے اور لفافے جمع کرانے اور رکھنے میں ہمیں اتنی محنت کرنا پڑی۔ جرمنی سے انگلستان سے، ہالینڈ سے، سوئٹزر لینڈ سے اور آپ نے ٹکاسی زبان ہلادی کہ اس میں تو کُچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے یہ سب ردّی چیزیں ہوں۔‘‘

فرمایا۔ ’’جایئے، صاحب جایئے۔‘‘

ہم نے کہا۔ "یہ تیسرا تھیلا بھی دیکھ لیجیے!"

بولے۔ "نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔۔۔ جائیے۔"

ہوا یہ کہ ایک اور صاحب آ کر ان کے کان میں کہہ گئے کہ یہ تو فلاں صاحب ہیں۔ کیوں اپنا وقت ان پر ضائع کرتے ہو۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارے تمام ہیرے اور زمرّد پاؤنڈوں اور ڈالروں کے نوٹوں کی گڈیاں، سونے کی اینٹیں، جڑاؤ گھڑیاں۔ سِلک کے تھان، افیم اور کوکین وغیرہ کے ڈلے اِسی تھیلے میں تھے۔

ڈائری لکھنے اور چھپوانے کا فائدہ یہ ہوا کہ احباب کو اپنے متعلّق عجیب طرح متفکّر پایا۔ رونی صورتیں، سوکھے چہرے، ہمدردی لبوں پر۔ معلوم ہوا ہماری فلاکت اور بے زری کا سن کر بعضوں نے تو ہمارے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ابنِ انشاء ریلیف فنڈ کھول دیا ہے جس میں دیے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس بھی معاف رہے گا۔ بعض اہل درو دُکانداروں اور چائے خانوں والوں نے بھی جو جنگ پڑھتے ہیں۔ از خود ہمارے نام بند و قچیاں کاؤنٹر پر رکھ دی ہیں۔ جن لوگوں سے ہمیں اس قسم کے تقاضے کا کھٹکا تھا کہ ہمارا ٹیپ ریکارڈ کدھر ہے، ہمارا کیمرہ نکالو وغیرہ۔ انہوں نے بلائیں لے کر اور آنسو پی کر کہا۔ یہاں تم آ گئے ہو، سب چیزیں آ گئیں۔ بلکہ

ایک مہربان نے تو ہماری دِلجوئی کے لیے ایک ٹرانزسٹر بھی بازار سے خرید کر ہماری نذر کیا ہے۔